مقالاتِ نو

ڈاکٹر محمد مظاہرالحق

ڈاکٹر محمد مظاہر الحق

MAQALAT-E-NAV
BY
DR. MD. MOZAHERUL HAQUE
09471865149 (Mob)

کتاب کا نام : مقالاتِ نو
صنف : تنقید و تحقیق
مصنف و ناشر : ڈاکٹر محمد مظاہر الحق
سال اشاعت : ۲۰۱۲ء
قیمت : تین سو روپے Rs 300/-
کمپوزنگ : GANGA JAMUNA PARKASHAN
C/6, Raod No. 5, 'R' Block,
PATNA- PIN . 800001
Ph : 0612-2226905

ملنے کا پتہ : نعمت اللہ ایجوکیشنل سوسائیٹی،
شاہین منزل، نوگھروا، سلطان گنج،
پٹنہ ۸۰۰۰۰۶

انتساب

الحاج حضرت مولانا شاہ محمد اشرف مجیب قادری فریدی قدس اللہ سرہ

(بانی خانقاہ فریدیہ ۱۳۰۹ھجہ' پھلواری شریف پٹنہ)

کی مقدس بارگاہ میں

ولادت ۲۸رشوال ۱۲۵۲ہجری، رحلت ۹رشعبان ۱۳۱۳ہجری

فہرست

مقدّمہ

ڈاکٹر محمد مظاہر الحق بلا شبہ ایک معروف ناقد، محقق، تاثراتی و شخصی مضمون نگار، صاحبِ طرز انشائیہ نگار اور افسانہ نویس ہیں۔ موصوف کی ذاتی و ادبی شخصیت تراشیدہ ہیرے کی طرح پہلودار ہے۔ وہ گزشتہ چار دہائیوں سے مسلسل ادبی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اب تک بشمول مجموعۂ انشائیہ (مسند ہے میرا فرمایا ہوا) اُن کی سات تنقیدی و تحقیقی کتابیں منظرِ عام پر آچکی ہیں۔ شائع شدہ کتابوں کی خوب خوب پذیرائی ہوئی اور اُن کی سینکڑوں کاپیاں مختلف لائبریریوں کے لئے خریدی گئیں۔ اُن کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ اُنہوں نے آج تک کسی کتاب کا نہ اجراء کرایا اور نہ ہی تشہیر کی۔ ظاہر ہے اُنہیں اپنے علم و آگہی، قلم اور تخلیقات پر مکمل اعتماد ہے۔ ایسی 'خود اعتمادی' درحقیقت فنی مجاہدہ، علم و دانش کی سیرابی، اظہارِ خیال میں دسترس، زبان و بیان پر قدرت، مطالعے کی وسعت اور مشاہدے کی باریک بینی سے ہی ممکن ہے۔ کیونکہ ٹین کے ڈبّے سے طبلے کی دلکش آواز نہیں نکالی جاسکتی۔ مذکورہ حقائق سے آشنا بیشتر قلمکار اِس پُرخطر وادی میں قدم رکھنے سے گریز کرتے اور آگے نکلنے کی چاہت میں پگڈنڈی کا انتخاب کرلیتے ہیں۔ خاص طور پر اُن قلمکاروں کو مذکورہ خوبیوں کی تقلید ضرور کرنی چاہئے، جو ایک کتاب شائع کرواکر مدّتوں اُس کے تشہیری مہم میں لگے رہتے ہیں۔ اِس عمل سے نہ اُنہیں دائمی فائدہ پہنچتا ہے اور نہ ہی اُردو زبان وادب کے سرمائے میں قابلِ ذکر اضافہ ہوتا ہے۔

ڈاکٹر محمد مظاہر الحق نے 'مقالاتِ نو' میں 'کلاسیکی اُردو شاعری کا احتجاجی شعور'، 'داغؔ دہلوی کا تغزل'، 'صنف قصیدہ اور اُس کے لوازم'، 'میر انیسؔ'، 'حکیم لطیف احمد اور بشیر الدّین احمد دہلوی کے تعلقات خطوط کی روشنی میں'، 'اُردو کا پہلا نفسیاتی ناول' اور 'مرزا رسوا اور ان کی

ناول نویسی کا محرّک' کے عنوانات سے تنقیدی و تحقیقی مقالات کے علاوہ 'علامہ واقف عظیم آبادی کی شخصیت کے مخفی پہلو'، 'پروفیسر محمد مصلح الدین - تعارف و تجزیہ'، 'پروفیسر محمد یونس حسین حکیم'، 'پروفیسر محمد شفاعت' اور 'جمیلہ خاتون' کے عنوانات سے تاثراتی مضامین کو شامل کیا ہے۔

میدانِ ادب میں ایسے ادبا و شعراُ کی بہت بڑی تعداد موجود ہے، جن کی تخلیقات معیاری ادبی جرائد میں جگہ نہیں پاتیں۔ لہٰذا ادب میں اپنی موجودگی کا احساس دلانے کے لئے اُنہیں کتابیں شائع کروانی پڑتی ہیں۔ اِس معاملے میں بھی ڈاکٹر محمد مظاہر الحق کی شان انفرادی ہے۔ صوبائی و ملکی سطح پر معیاری ادبی جرائد و اخبارات میں اُن کی تخلیقات کو نمایاں طور پر شائع کیا جاتا رہا ہے۔ یعنی کتابی شکل میں اشاعت سے قبل اُن کے تقریباً تمام مقالات، تاثراتی مضامین، انشایئے اور افسانے شائع ہو چکے ہیں۔ مثلاً 'اُردو شاعری کا احتجاجی شعور' ۱۹۹۲ء میں 'نقوش'، لاہور میں، 'حکیم لطیف احمد اور بشیر الدّین احمد دہلوی کے تعلقات خطوط کی روشنی میں'، 'مریخ'، پٹنہ میں، 'داغ دہلوی کا تغزل'، 'کاوش جدید' کانپور میں، 'میر انیس'، 'مسئلہ'، مظفر پور میں، 'مرزا رسوا کی ناول نگاری' اور 'اُردو کا پہلا ناول نگار'، 'زبان و ادب' پٹنہ میں، 'صنف قصیدہ اور اُس کے لوازم'، 'ندائے عوام'، پٹنہ میں، 'پروفیسر محمد مصلح الدّین - تعارف و تجزیہ' اور 'پروفیسر محمد شفاعت'، 'انقلاب جدید'، پٹنہ میں، 'جمیلہ خاتون' اور 'علامہ واقف عظیم آبادی کی شخصیت کے مخفی پہلو'، 'قومی تنظیم'، پٹنہ میں شائع ہو کر قارئین سے داد و تحسین وصول چکے ہیں۔

ڈاکٹر محمد مظاہر الحق کے 'تنقیدی و تحقیقی مقالات' موضوعات کے فنی نِکات کی گرہیں کھول کر علم و آگہی میں اضافہ کرتے ہیں۔ 'تجسس' کو تسکین، 'تلاش' کو منزل بخشتے اور ذہن کے بند دریچوں کو وا کرتے ہیں۔ اُن کا تحقیقی عمل اُقلیدسی نہیں، سائنسی و منطقی ہے۔ وہ کسی نکتہ کے مثبت یا منفی پہلو کو ثابت کرنے کے لئے دلائل تلاش نہیں کرتے بلکہ حقائق کی روشنی میں نِکات کو محققانہ و تنقیدی پیرائے میں مدلّل سامنے لاتے ہیں۔ دراصل تحقیق و تنقید کا یہی تقاضا اور نصب العین بھی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ محقق خضرؑ صفت اور ناقد منصف مزاج ہوتا ہے۔ وہ اُدق و پیچیدہ نِکات کو مزید الجھاتا نہیں بلکہ اُن کے بل وخم کو درست کر کے اُنہیں قابلِ فہم بنا دیتا ہے۔ 'مقالاتِ نو' میں شامل مقالوں کے مطالعے سے ڈاکٹر محمد مظاہر الحق کے پختہ ناقدانہ شعور، تحقیقی کاوشوں اور تخلیقی رویّوں نیز اُن کے گہرے علم و آگہی کا بھی بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ نقد و تحقیق میں موصوف کا رویّہ دانشورانہ، منصفانہ اور غیر جانبدارانہ ہے۔

وہ کسی بات کو اشارے کنائے میں نہیں کہتے بلکہ مطالعے کی روشنی میں اپنی ذاتی رائے کا برملا اظہار کرتے ہیں۔ تنقید و تحقیق، مضامین و تاثراتی مضامین، انشائیے اور افسانے کے لئے وہ الگ الگ زبان و انشاءٔ کا استعمال کرتے ہیں۔ مجموعی طور پر اُن کی زبان صاف ستھری ہے۔ اُن کے جملے رواں اور ترسیلِ خیال میں معاون ہوتے ہیں۔ وہ ادق الفاظ اور اصطلاحات کے استعمال سے گریز کرتے ہیں۔ بعض ناقدینِ ادب کی طرح قارئین کو محض مرعوب کرنے کی غرض سے وہ غیر ضروری طور پر اپنے علم وعرفان کی تشہیر نہیں کرتے اور نہ ہی مشاہیرِ ادب کے اقوال و اقتباسات کو غیری ضروری طور پر نقل کرتے ہیں۔ وہ اپنے نقطۂ نظر سے حقائق کا ناقدانہ تجزیہ کرتے اور نتیجہ اخذ کرتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ اُن کے مقالوں میں پختگی، جامعیت، تصنع و تکلف کی بجائے بے ساختگی اور دلکشی ہوتی ہے۔ اُن کے رواں اور شگفتہ اُسلوبِ بیان کے سبب قاری مطالعے کی طویل مسافت کو سبک رفتاری سے طے کر لیتا اور اُسے علم کی سیرابی کے ساتھ ساتھ مطالعے کی سرخوشی کا بھی احساس ہوتا ہے۔

اِس حقیقت کو قطعی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ کسی شخص یا شخصیت کے حالات و کوائف اور خدمات و کارنامے پر مرکوز تاثراتی مضمون کا مضمون نگار اگر چاہے تو انتہائی بے خوفی و بے شرمی سے متوفّی کی زبانی اور واقعات کے توسط سے بہت کچھ اپنے فن اور تعلقات پر کہلوا سکتا اور خود کو یارِ غار ثابت کر سکتا ہے۔ وہ ناقابلِ یقین باتوں کو 'راز کی بات' کہہ کر افشاں کر سکتا اور فرضی واقعات بھی گڑھ سکتا ہے۔ ظاہر ہے مردے احتجاج و تردید سے عاجز و قاصر ہوتے ہیں۔ دوسری جانب زندہ شخصیت پر تاثراتی مضمون لکھنا بھی کم جوکھم بھرا کام نہیں کہ زندہ شخصیت فوراً 'فلاں اہم بات و واقعات' کو چھوڑ دینے کے شاکی اور 'بعض نکات و واقعات' کو شاملِ مضمون کر دینے پر زندگی اجیرن کر دیتے ہیں۔ ڈاکٹر محمد مظاہر الحق نے تلوار کی دھار پر چلنے جیسے اِس عمل کو بھی آسان بنا دیا ہے۔ دیانتداری کے ساتھ بے باک اُسلوب اپنا کر وہ اِس پُر خطر وادی سے بخوبی گزر گئے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ تاثراتی مضامین میں شامل واقعات و بیانات کی صحت پر شبہ نہیں ہوتا۔ دراصل یہی اعتبار 'اعجازِ فن' ہے، جہاں فن اور فنکار ایک دوسرے کی پہچان اور آئینہ بن جاتے ہیں۔ سب سے مشکل کام اُنہوں نے اپنی والدہ ماجدہ کے تاثراتی مضمون میں انجام دیا ہے۔ قاری کو مضمون پڑھتے وقت یہ احساس ہوگا کہ مضمون نگار نے مرحومہ جمیلہ خاتون کی صفاتِ عالیہ، اطوارِ حسنہ، خیالات و جذباتِ پاکیزہ، ایثار و محبت، صوم وصلوٰۃ کی پابندی، خدا کی راہ میں سب

کچھ قربان کردینے کا جذبہ صادق، عزیز و اقارب کی ضیافت، اقربا پروری اور غربا و مساکین کی دست گیری کے بیان میں انتہائی غیر جانبداری سے کام لیا ہے۔ ضبطِ تحریر میں ایسا اعتدال، واقعات کا ایسا حسنِ انتخاب، بیان میں ایسی ڈرامائیت واثر انگیزی عطیہ ربّانی کے سوا کچھ اور نہیں۔ کم و بیش یہی خوبی 'علامہ واقف عظیم آبادی کی شخصیت کے مخفی پہلو'، 'پروفیسر محمد یونس حسین حکیم'، 'پروفیسر محمد شفاعت' اور 'پروفیسر محمد مصلح الدین - تعارف و تجزیہ' کا ہے۔

ڈاکٹر محمد مظاہر الحق کے انشائیے خطۂ زعفران کی سیر کراتے ہوئے حقائق کی پُر خطر گھاٹی میں لا کھڑا کردیتے ہیں۔ قاری حقائق سے روبرو ہو کر مضطرب ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ اضطراب منفی اثرات مرتب نہیں کرتا اور نہ ہی قاری معاشرے کا مکروہ چہرہ دیکھ کر متنفر ہوتا ہے بلکہ اُس کے دل میں معاشرے کے ساتھ ساتھ اخلاقی انحطاط و زوال کی اصلاح کا خفتہ جذبہ بھی بیدار ہونے لگتا ہے۔ خیالات و رُجحانات میں رونما انقلاب دراصل انشائیہ نگار کی کامیابی کا اعلامیہ اور بیّن ثبوت ہے۔ 'مستند ہے میرا فرمایا ہوا' میں شامل تقریباً سبھی انشائیے 'آکاشوانی پٹنہ' سے نشر اور مختلف جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔

ڈاکٹر محمد مظاہر الحق کے افسانے بھی معاشرہ کے آئینہ دار اور عصری حسیّت کو بخوبی پیش کرتے ہیں۔ صنف افسانہ سے اُن کے عدم التفات کا معقول سبب راقم الحروف کو نظر نہیں آتا ہے۔ کاش! اِس جانب بھی موصوف تھوڑی توجہ دے پاتے۔

المختصر 'مقالاتِ نو' ایک قابلِ مطالعہ تصنیف ہے۔ بالخصوص ریسرچ اسکالروں اور طالب علموں کے لئے یہ کتاب انتہائی مفید ثابت ہوگی۔ انشاءاللہ یہ کتاب بھی لائبریریوں کی زینت بنے گی اور اِس کی پذیرائی توقع سے زیادہ ہوگی۔ خدا کرے ڈاکٹر محمد مظاہر الحق زبان و ادب اُردو کی نمایاں خدمات انجام دیتے رہیں، یہی میری تمنا اور دعا بھی ہے۔

ڈاکٹر شاہد جمیل

یکم مئی ۲۰۱۲ء

DR. SHAHID JAMIL, Qr No. C/6, Raod No. 5, 'R' Block,
PATNA- PIN 800001 (BIHAR) (Mob) : 09430559161
Email : drshahidjamil@rediffmail.com/
drshahidjamilpatna@gmail.com

کلاسیکی اُردو شاعری کا احتجاجی شعور

شمالی ہندوستان میں اُردو کا پہلا دور مغلیہ سلطنت کے عہدِ زوال سے وابستہ ہے۔ ظاہر ہے کہ کمزور سلطنت میں ہر طرح کی کمزوریاں اور بُرائیاں پنپتی ہیں اور تشنہ کامی و نامرادی، محرومی و عُسرت اور ناآسودگی کی پریشان کن اور تکلیف دہ کیفیت معاشرتی ماحول میں تیزی کے ساتھ پھیلنے لگتی ہے۔ اورنگ زیب عالم گیر کے عہد میں جنگوں اور خانہ جنگیوں کا سلسلہ جاری تھا لیکن انتشار و اضطراب کی جو عام صورت حال موجود تھی، اس سے اس وقت کے ذہن و مزاج میں تشکیک و تردّد پیدا کیا اور اُردو شاعری نے اپنے اس ارتقا کے پہلے دور میں ایک واضح ردّعمل کا اظہار بھی کیا۔ بقول ڈاکٹر اعجاز حسین

> ''مغلیہ سلطنت کی کمزوری ملک کی بدحالی اور سماج کی ابتری کا پیام تھی۔ اندرونی و بیرونی حملوں سے ہندوستان پامال ہو رہا تھا۔ نہ کسی کی جان محفوظ تھی نہ کسی کو کھانے کی طرف سے اطمینان تھا۔ جس بے اطمینانی اور انتشار میں زندگی مبتلا تھی اس کا نقشہ اس وقت کی اردو شاعری میں پوری طرح نظر آ رہا ہے۔''
>
> (اُردو شاعری کا سماجی پس منظر، صفحہ ۱۶۵)

ارتقائی دور کے اس اوّلین مرحلے میں جابجا ایسے تند و تیز میلان کا اظہار ہوا ہے

جسے شعورِ احتجاج کے ذیل میں رکھا جا سکتا ہے۔ مگر اُردو میں احتجاجی شاعری کی احتجاجی روایت کا باضابطہ اظہار میر جعفر زٹلی کی شاعری میں ہوا ہے۔ مذکورہ خیال کی تائید و توثیق ڈاکٹر محمد حسن کے درج ذیل بیان سے بھی ہوتی ہے۔ ملاحظہ ہو

> ''شمالی ہند کے اردو ادب میں احتجاج کی روایت میر جعفر زٹلی سے شروع ہوتی ہے، جس کا کلام محض لسانی اعتبار ہی سے سماجی احتجاج کا نمونہ نہیں ہے کہ اس میں فارسی اور عربی کے ثقہ الفاظ کے ساتھ ریختہ کی گرمی، بڑی عام بول چال کی تراکیب مِل جُل کر کچھ اس طرح برتی گئی ہیں کہ اس دور کی متانت اور ثقاہت مجروح ہوئی اور شاعر نے اپنا احتجاج طنز و مزاح کے پردے میں اپنے دور کے سماج کے خلاف برملا نظم کر دیا۔ جعفر زٹلی کے کلام کی احتجاجی لَے اس اعتبار سے بھی بلند ہے کہ اس نے اوضاع زمانہ کی ناہمواریوں کو بے نقاب کر کے رکھ دیا۔''
>
> (عصری ادب، دہلی، شمارہ اگست ۱۹۷۷ء، صفحہ ۳۱)

جعفر زٹلی کلاسیکی شاعر ہونے کے باوجود محض روایت پرستی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنی جرأت بیانی کی وجہ سے بے حد مشہور ہوئے۔ فرخ سیر کے عہد میں غذائی اجناس کافی گراں تھے۔ جس کی وجہ سے عوام کافی پریشان تھے۔ چنانچہ جعفر زٹلی نے بادشاہ کے عتاب کی پرواہ کئے بغیر درج ذیل سکّہ قلم بند کیا۔ ملاحظہ ہو

سکّہ زد بر گندم و موٹھ و مٹر　　　بادشاہ پستہ کش فرخ سیر

احتجاج کی یہ طنز آمیز لَے بادشاہ کے لئے اتنی ناگوار ثابت ہوئی کہ اسے قتل کرا دیا۔ جعفر زٹلی کے کلام میں مشتعل جذبات کی جو کیفیت ہے اس کے پس منظر میں عوامی دردمندی کا ایک نہایت واضح شعور موجود ہے۔ اس نے اپنے عہد کی خستہ حالی اور اخلاقی پستی کا نقشہ کچھ اس طرح کھینچا ہے۔ ملاحظہ ہو :

گیا اخلاص عالم سے عجب یہ دور آیا ہے
ڈرے جب خلق ظالم سے عجب یہ دور آیا ہے
نہ یاروں میں رہی یاری نہ بھائیوں میں وفاداری
محبت اُٹھ گئی ساری، عجب یہ دور آیا ہے
نہ بولے راستی کوئی، عمر سب جھوٹ میں کھوئی
اتاری شرم کی لوئی، عجب یہ دور آیا ہے
جنہوں کا نام ہے عاشق، انھوں کا نام ہے فاسق
ہزاروں میں کوئی صادق، عجب یہ دور آیا ہے
دیا کرتے رہو جاناں بھلائی کی سنگ لے جانا
کہے جعفر پورکھ سیانہ، عجب یہ دور آیا ہے

اُردو شاعری کے ارتقائی تاریخ کے پہلے دور کے شاعروں میں قائم، سودا، میر تقی میر وغیرہ شامل ہیں۔ ان شعراء نے مطلق العنان حکمرانوں کی غلط کاری اور بدانتظامی کو بھی نشانہ طنز وہدف بنانے سے گریز نہیں کیا۔ ان کی ہجوئیں اور شہر آشوب میں احتجاج کی لے بے حد صاف ہے اور یہ متعلقہ عہد کے معاشرتی تضادات، طبقاتی ناہمواری اور اقتصادی ناآسودگی کی ترجمانی کرتی ہے۔ قائم چاند پوری کا ردِّعمل 'شہر آشوب' کے درج ذیل بندوں میں ملاحظہ فرمائیں:

اک نانِ خشک شب کو میسر کسی کو آئے ممکن ہے کیا کہ بیٹھ کے آسودگی سے کھائے
نیچے چھپے زمین کے یا آسماں پہ جائے یوں گرد و پیش گھیرے ہے اک خلقت، خدائے
جس طرح حصار میں ہالے کے ماہ ہے

اس پر علاوہ، بن سے جو آتا ہے اب پیٹھان چھپر کسی کا چھینے ہے لے ہے کسی کا چھان
کہتا ہے، ہیں یہ مونج کے، میرے پلنگ کے بان اور اُس کتاب پر تو اُٹھاتا ہے سو قران
مخزن کو جس کی جلد سے تک اشتباہ ہے

یہ بیانیہ جرأت و جسارت اُردو شاعری کی امتیازی اور قابلِ قدر صفت ہے۔ اس سے اس امر کی نشاندہی ہوتی ہے کہ مطلق العنان حکمرانوں کے عہد میں بھی ہمارے شاعروں نے کاسہ لیسی پر کبھی انحصار نہیں کیا اور حق و انصاف کی پاسداری اور حمایت میں اقتدارِ وقت کی پرواہ کئے بغیر اپنے خیال و احساس کا اظہار کرتے رہے۔

سوداؔ کی ہجویات اور شہر آشوب میں بھی یہ شعورِ عصر اور احتجاج کی کیفیت موجود ہے، بلکہ سوداؔ، نظیرؔ اور میر تقی میرؔ سب نے دہلی کی بار بار تباہی کو دیکھا۔ اس کی وجہ سے انتشار و اضطراب کی جو فضا پنپ رہی تھی اور اس کے جو اثرات عوامی معاشرے پر مرتسم ہو رہے تھے انہیں شدّت سے محسوس کیا اور اپنے واضح ردِّعمل کو شعری پیکروں میں منتقل کیا۔ معاشرے کی بدحالی، اقتصادی بے بسی اور اخلاقی ابتری پر میر تقی میرؔ کا ردِّعمل 'شہر آشوب' کے درج ذیل بندوں میں ملاحظہ فرمائیں:

آئے لشکر میں ہم برائے تلاش   مشکل اپنی ہوئی جو بود و باش
ہے لب ناں پہ سو جگہ پُرخاش   آن کے دیکھی یاں کی طرفہ معاش
نے دمِ آب ہے، نہ چمچہ آش

جو شناسا ملا سو بے اسباب   مرنے کے مرتبے پہ ہیں احباب
جس کے ہے پال تو نہیں ہے طناب   تنگدستی ہے سب بہ حالِ خراب
جس کے ہے فرش تو نہیں ہے فراش

کنجڑے جھنکتے ہیں روتے ہیں بقال   زندگانی ہوئی ہے، سب پہ وبال
ایک تلوار بیچتے ہیں یک ڈھال   پوچھو مت کچھ سپاہیوں کا حال
بادشاہ و وزیر سب قلاش

متواتر جنگوں نے انتظامیہ کو برباد کر دیا تھا۔ جس کی وجہ سے نااہلوں کو عروج حاصل ہو گیا تھا۔ شرفا اپنی جگہوں پر سمٹے سہمے ہوئے تھے۔ اس انتشار و خلفشار اور متضاد النوع حالات کو نظیرؔ نے اس طرح بیان کیا ہے۔ یہاں 'دنیا' سے چند بند رقم کئے جاتے ہیں :

جو گونگا ہے وہ کھڑا فارسی بگھاڑے ہے　　زباں ہے جس کی اشارے سے وہ پکارے ہے
اچھل کے مینڈک ہاتھی کے لات مارے ہے　　کلاہ ہنس کا کوا کھڑا اتارے ہے
غرض میں کیا کہوں دنیا عجب تماشا ہے

جو عقل رکھتے ہیں وہ باولے دوانے ہیں　　جنھوں میں عقل نہیں وہ بڑے سیانے ہیں
جو مرد ہیں وہ بڑے ہجڑے زمانے ہیں　　زنانے شوق سے مردوں کے پہنے بانے ہیں
غرض میں کیا کہوں دنیا عجب تماشا ہے

جو کان والے ہیں بیٹھے وہ سر کو دھنتے ہیں　　جنھوں کے کان نہیں دور کی سنتے ہیں
کباب بھونتے ہیں اور کبابی بھنتے ہیں　　برستے دھوئیں ہیں اور ابر تنکے چنتے ہیں
غرض میں کیا کہوں دنیا عجب تماشا ہے

جو آدمی ہیں وہ سب ان کے پاؤں پڑتے ہیں　　خبیث دیو پلید آہ ہر ایک سے لڑتے ہیں
یہ قہر دیکھو کہ زندوں سے مردے ڈرتے ہیں　　بلائیں لپٹی ہیں اور بھوت جن جھگڑتے ہیں
غرض میں کیا کہوں دنیا عجب تماشا ہے

یہاں نظیر نے عصری زندگی کی تلخ صداقتوں کو متضاد مشاہدوں اور تجربوں اور ان سے وابستہ سنگینیوں کو جس تفصیل اور واقعیت شعاری کے ساتھ پیش کیا ہے وہ محتاجِ تعارف نہیں ہے۔ ان کے طنزیہ اُسلوب میں تلخی و برہمی کا ملا جلا احساس نمایاں ہے۔

تضحیکِ روزگار، شہر آشوب، کوتوال کی ہجو میں سوداؔ نے اپنے عہد کی تفصیلات اور تلخ سچائیوں کو نہایت خوب صورتی سے پیش کیا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نہایت خستہ حالی، مصاہب آلودہ اور فاقہ زدہ معاشرتی نظام نے نحیف و ناتواں گھوڑے کی علالت اختیار کر لی ہو۔ سوداؔ کے شعری لہجے میں احتجاج کی جو تپش اور برہمی نمایاں ہے اس کی مثالیں دیکھیے:

ناکارہ گھوڑے کی تصویر

آگے سے توبڑا اسے دکھلائے تھا سیس — پیچھے نقیب ہانکے تھا لاٹھی سے مار مار
ہرگز وہ اس طرح بھی نہ لاتا تھا روبراہ — ہلتا نہ تھا زمین سے، مانند کوہسار
اس مضحکے کو دیکھ ہوئے جمع خاص و عام — اکثر مدبروں میں سے کہتے تھے یوں پکار
پہیے اسے لگاؤ کہ تا ہووے یہ رواں — یا بادبان باندھیو یوں کہ دو اختیار

ہجو شیدی فولاد خاں کوتوال

طرۂ شمع اک طرف اے یار — گم ہے خورشید کی بھی شب دستار
شام سے صبح تک یہی ہے شور — دوڑیو گھوڑی لے چلا ہے چور
صبح شبنم جو گل پہ ہوتی ہے — بقچہ کو غنچے کے وہ روتی ہے
اب تو درزی کا کچھ نہیں ہے ڈھنگ — کہتے پھرتے ہیں چور ہو سرہنگ

اس دور کی غزلوں میں احساسات کا ایسا ردِّ عمل موجود و موجزن ہے جس میں احتجاجی لے کی دھیمی دھیمی آنچ لو دیتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ یہاں صنف غزل کی داخلیت شعاری پر روشنی ڈالنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس حقیقت سے کم و بیش تمام لوگ واقف ہیں کہ غزل کا تخلیقی مزاج، بشری نفسیات اور داخلی کیفیات کا رازداں اور ترجمان رہا ہے۔ خارجی حالات کی تلخیوں اور سختیوں کو تخلیقی شعور کا حصہ بنا کر غزل نگاروں نے اپنے جس ردِّ عمل کو جس ذکاوت و ذہانت اور پیمانۂ لطافت کے ساتھ شعری پیکروں میں منتقل کیا ہے اس کی چند مثالیں درج ذیل ہیں:

زندگی محبوب کیا کیا اس میں محبوبیاں — بے وفائی نے پر اس کی دیں متاسب خوبیاں
(سودا)

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے — ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے
(درد)

نہ بھائی مجھے زندگانی نہ بھائی — مجھے مار ڈالو مجھے مار ڈالو
(سوز)

روایت ہے کہ زیر تذکرہ عہد میں دہلی سات مرتبہ لوٹی گئی۔ دل اور دہلی کا مشترک المیہ اشعار ذیل میں ملاحظہ فرمائیں :

نکل کے شہر سے ٹک سیر کر مزاروں کا
ملا ہے خاک میں کس کس طرح کا عالم یاں

یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا
دل کی بربادی کا کیا مذکور ہے

ورنہ ہر اک قدم پہ یاں گھر تھا
اب خرابہ ہوا جہاں آباد

مذکورہ اشعار اس حقیقت کی نشاندہی کرتے ہیں کہ متقدمین نے اپنے عہد کے مصائب و آلام کو نہ صرف منظر عام پر لایا بلکہ عوامی ردِّ عمل کا اظہار بھی کیا اور اعلیٰ انسانی قدروں کے حفظ و بقا کے سلسلے میں اپنے مثبت احتجاجی شعور کو اپنی تخلیقات میں پیش بھی کرتے رہے۔

یہ تاریخی حقیقت ہمارے پیش نظر ہے کہ پلاسی کی جنگ کے بعد انگریزوں کے اثرات میں تیزی کے ساتھ اضافہ ہونے لگا۔ رفتہ رفتہ ان کی تجارتی سرگرمیاں، سیاسی نوعیت اختیار کرتی گئیں اور مقامی ریاستوں پر بھی ایسٹ انڈیا کمپنی غاصبانہ قبضہ کرنے لگی۔ حتیٰ کہ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے روز افزوں بڑھتے ہوئے اقتدار پر قابو پانے کی خاطر آخری ناکام کوشش کی گئی۔ ۱۸۵۷ء کی اس اوّلین ناکام جنگ آزادی کا ردِّ عمل یہ ہوا کہ سارے ہندوستان پر انگریزوں کی حاکمیت آئینی بن گئی۔ اس وقت کا ہندوستانی معاشرہ فطری طور پر اس تاریخی واقعے اور سانحے سے متاثر ہوا۔ شاعروں کی ذہانت، حساسیت اور بصیرت بھی اس صورت حال سے بے اثر نہیں رہی۔ بہادر شاہ ظفر تخت و تاج کے مالک تھے اور شاعر بھی۔ ان کی قلبی کیفیات کا حال دیکھئے :

گئی یک بیک جو ہوا پلٹ نہیں دل کو میرے قرار ہے
کروں غم ستم کا میں کیا بیاں، میرا سینہ غم سے فگار ہے
و لے شہر دہلی یہ تھا چمن، سبھی طرح کا یہاں تھا امن
وہ خطاب اس کا جو مٹ گیا، فقط اب تو اجڑا دیار ہے

یہ رعایا ہند تبہ ہوئی کہوں کیسی ان پہ جفا ہوئی
جسے دیکھا حاکمِ وقت نے کہا یہ تو قابلِ دار ہے

غالبؔ کے شعری لہجے میں فطری طور پر سوز و کسک اور تشکیک و تردّد کا عنصر یوں نمایاں ہوا:

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہ رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

داغِ فراق، صحبتِ شب کی جلی ہوئی
ایک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

خواجہ الطاف حسین حالیؔ کی احتجاجی لے ملاحظہ کیجئے:

صحبتیں اگلی مصور مجھے یاد آئیں گی
کوئی دل چسپ مرقع نہ دکھانا ہرگز

لے کے داغ آئے ہیں سینے پہ بہت، اے سیّاح
دیکھ اس شہر کے کھنڈروں میں نہ جانا ہرگز

چپے چپے پہ ہیں یاں گوہر یکتا تہِ خاک
دفن ہو گا نہ کہیں اتنا خزانہ ہرگز

بزمِ ماتم تو نہیں بزمِ سخن ہے حالیؔ
یاں مناسب نہیں رو رو کے رلانا ہرگز

حضرت منیرؔ کے چند منتخب اشعار ملاحظہ کیجئے :

دانہ دانہ کے لئے محتاج ہیں عالی گہر
اشکِ حسرت اپنے مروارید غلطاں ہو تو کیا

جاں بلب ہیں غم سے استادانِ فنِ نظم و نثر
مطمئن اس عہد میں دس بیس ناداں ہو تو کیا

۱۸۵۷ء کے المیے کے بعد رفتہ رفتہ حالات میں سکون پیدا ہونے لگا تو حسّاس طبع دانشوروں نے جسم و جان کے پیچھے کچھ سرمائے کو سمیٹنا شروع کیا۔ مایوسی و پستی، ذلّت و خواری، بے حسی اور بے عملی کی تاریکیوں سے معاشرے کو نجات دلانے کی تدبیریں اختیار کیں۔ سرسیّد کی اصلاحی تحریک نے ملّتِ اسلامیہ کو عزم و عمل کے ایک نئے شعور سے قریب تر کیا۔ حالیؔ نے ماضی کی عظیم الشان روایتوں کے پس منظر میں ایک بہتر معاشرے کے قیام کی پُر خلوص آرزومندی کو پیش کیا۔ اِسی دور میں اکبرالہٰ آبادی کی شاعری احتجاج کی ایک لَے بن کر اُبھری۔

اکبرالہٰ آبادی نے طنز کے نشتروں اور مزاح کے شگوفوں کے ذریعہ اپنے عہد کی تلخ سچائیوں کے ردِّ عمل میں ہنسا ہنسا کر رُلا دینے کے فن میں اپنی مہارت دِکھلائی۔ ملاحظہ ہو:

آخر کو ہوئے تم نہ اِدھر کے نہ اُدھر کے
انگریز بھی کھنچتے رہیں گے قوم بھی بیزار

خود اپنی قوم کی تحقیر کرنا اس کے کیا معنی
یہ کس جادو نے بچوں کو کیا خودبین و خودآرا

قومی تہذیب و تمدّن کی تعمیر و تخریب کے اس دورِ کشاکش میں اکبرالہٰ آبادی

کے احتجاج کی یہ لَے بے حد معنی آفریں اور صحت مند ثابت ہوئی۔ جس جوش و خروش کے ساتھ مغرب کی کورانہ تقلید کی جارہی تھی اگر اس کے خلاف احتجاج کی یہ ہلکی سی لَے بھی اس دور میں سامنے نہ آتی تو تہذیب مشرق کی ابتری اور زبوں حالی کا کچھ اور ہی رنگ ہوتا۔

اس دوران اصلاحی تحریک کے اثرات منظرِ عام پر آنے لگے تھے اور ان کا ایک واضح ردِّ عمل قومی دردمندی اور پُر جوش وطن پرستی کی صورت میں نمایاں ہو رہا تھا۔ کچھ ہی دنوں کے بعد قومی تحریک، سیاسی تحریک بننے لگی۔ حتیٰ کہ ۱۹۰۶ء میں ہندوستان نے خود اختیاری کا مطالبہ پیش کر دیا۔ سلف گورنمنٹ کے اس مطالبے کو پھر ۱۹۱۶ء میں ہوم رول کے عنوان سے پیش کیا گیا اور آزادی حاصل کرنے کی جنگ میں تیزی آ گئی۔ اس دور میں اُردو شاعری کی احتجاجی لَے نے انقلابی تیور اختیار کر لیا۔

قومی اور سیاسی تحریکات کے اس پُر آشوب عہد میں ایک طرف قومی محبت کا پُر خلوص جذبہ نمایاں رہا۔ دوسری طرف برطانیہ کے مستبد سامراجی نظام کے خلاف نعرے و غصّے کا خروش رواں رہا۔ ۱۹۱۲ء میں بلقان نے ترک کے خلاف اعلانِ جنگ کیا اور بعض مغربی طاقتوں نے بلقان کی پشت پناہی کی تو تمام اسلامی ملکوں میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ اس صورت حال سے متاثر ہو کر شبلی نعمانی نے 'شہر آشوبِ اسلام' کی تخلیق کی جس میں ردِّ عمل کی نوعیت ملاحظہ ہو:

چلیں گی بادِ تند و تیز کی یہ آندھیاں کب تک
ہم اپنے خون سے سینچیں گے ان کی کھیتیاں کب تک

حکومت پر زوال آیا تو پھر نام و نشان کب تک
چراغ کشتہ محفل سے اُٹھے گا دھواں کب تک

قبائے سلطنت کے گر فلک نے کر دئے پُرزے
فضائے آسمانی میں اڑیں گی دھجیاں کب تک

مراکش جا چکا، فارس گیا، اب دیکھنا یہ ہے
کہ جیتا ہے یہ ترکی کا مریضِ نیم جان کب تک

۱۹۱۶ء میں نو آبادیات کا درجہ حاصل کرنے کے لئے ہندوستانیوں کی جدو جہد تیز ہونے لگی جنگِ عظیم اور اس کے ہولناک اثرات کے پنپنے کا یہی عہد ہے۔ ہندوستانی معاشرہ میں اپنے حقوق حاصل کرنے کا جذبہ قوی تر ہوتا جا رہا تھا۔ حب الوطنی اور قومیت پسندی کے جذبات نے تمام قومی و سیاسی تحریکوں کو متحد اور منظم کر دیا۔ ہندوستان بیدار اور متحرک ہوا تو جوش و جذبے کے ساتھ ایثار و قربانی کی مثالیں قائم کی جانے لگیں۔ پنڈت برج نارائن چکبست کی نظم 'وطن کا راگ' کے دو بند دیکھئے:

وطن پرست شہیدوں کی خاک لائیں گے ہم اپنی آنکھ کا سرمہ بنائیں گے
غریب ماں کے لئے درد دکھ اُٹھائیں گے یہی پیامِ وفا قوم کو سنائیں گے

طلب فضول ہے کانٹے کی، پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم، ہوم رول کے بدلے

ہمارے واسطے زنجیر و طوق گہنا ہے وفا کے شوق میں گاندھی نے جس کو پہنا ہے
سمجھ لیا کہ ہمیں درد و رنج سہنا ہے مگر زباں سے کہیں گے وہی جو کہنا ہے

طلب فضول ہے کانٹے کی، پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم، ہوم رول کے بدلے

نظم 'خاکِ وطن' میں درگا سہائے سرور جہاں آبادی کا ردِ عمل دیکھئے:

آہ اے خاکِ وطن! اے دردمند و بے قرار آہ اے شوریدہ قسمت اے پریشاں روزگار

اُڑ رہا تھا پرچمِ شوکت ترا افلاک پر سرنگوں ہے تیری عظمت کا نشاں اب خاک پر

تیری شہرت کے نگیں خاکِ عدم میں ہیں نہاں اب نہ وہ تختِ مرصّع ہے نہ تاجِ زر فشاں

۱۹۱۰ء سے ۱۹۳۵ء کے دوران قومی سطح پر جو معاشرتی اور سیاسی سرگرمیاں متواتر رونما ہوتی رہیں، ان سب نے مل جل کر ہندوستان کے عوام کو برطانیہ کے سامراجی ماحول سے فیصلہ کن لڑائی کے لئے آمادہ کردیا۔قومی انقلاب کے لئے اقبال کی شاعری نے قلب وروح کی بیداری کا سامان کیا تو سیاسی اور خارجی انقلاب کی راہیں تیزی سے ہموار ہونے لگیں ۔اس رجحان کی نشاندہی کے لئے ظفر علی خاں کی نظم بعنوان 'گاندھی بردولی سے پہلے' سے چند اشعار ملاحظہ ہو :

گاندھی نے آج جنگ کا اعلان کر دیا ۔۔۔ باطل کو حق سے دست و گریبان کردیا

سر رکھ دیا رضائے خدا کی حریم پر ۔۔۔ خنجر کو پھر حوالۂ شیطان کر دیا

ہندوستان میں ایک نئی روح پھونک کر ۔۔۔ آزادیِ حیات کا سامان کر دیا

الغرض کلاسیکی اُردو شاعری کا احتجاجی شعور ہر دور میں زندہ ومتحرک رہا ہے۔

□□

داغ دہلوی کا تغزل

داغؔ کی ولادت ۱۲؍ذی الحجہ ۱۲۴۶ھ یعنی ۲۵؍مئی ۱۸۳۱ء کو محلّہ چاندنی چوک دہلی میں ہوئی اُس وقت دن کے ۲ بجے تھے۔ داغؔ کا اصل نام نواب ابراہیم تھا۔ شادی کے بعد یاروں نے نواب مرزا سے ملقب کیا۔ آگے چل کر یہ نام کافی مشہور ہوا۔

داغؔ کے والد کا نام نواب شمس الدین احمد خاں تھا۔ فیروز پور جھرکہ کے حاکم تھے۔ جنہیں انگریزوں نے ۱۸؍اکتوبر ۱۸۳۵ء کو کشمیری دروازے کے باہر پھانسی دے دی تھی۔ اس وقت نوسو فوجیوں کا سخت پہرہ تھا۔ انہیں یہ پھانسی فریزر ایجینٹ گورنر جنرل دہلی کے قتل کی سازش میں ملوث ہونے کے شبہ میں دی گئی۔

داغؔ کی والدہ کا اصل نام وزیر بیگم تھا۔ لیکن جب ان کی دوسری شادی مرزا فخرو سے ہوئی تو وہ چھوٹی بیگم سے مشہور ہوئیں۔ ان کی پہلی شادی نواب شمس الدین خاں فیروز پور جھرکہ سے ہوئی تھی۔ اُسی شادی کی نشانی داغؔ تھے۔

داغؔ کی تعلیم کی بسم اللہ مولوی غیاث الدین اور مولوی میر احمد حسین کے ہاتھوں ہوئی۔ آگے چل کر ذوقؔ کے شاگرد ہوئے۔ داغؔ کا تعلق اس اسکول سے ہے جو قدیم روایات کا حامل ہے اور جس نے اُردو زبان کی ترقی و ترویج میں کارہائے نمایاں انجام دئے ہیں۔ جس اسکول کی ولیؔ نے داغ بیل ڈالی تھی۔ اسے حاتمؔ، سوداؔ، قائمؔ، نصیرؔ، ذوقؔ اور داغؔ نے نہ صرف یہ کہ آگے بڑھایا بلکہ ایک نئے باب کا اضافہ بھی کیا۔ اگر یہ کہا جائے

تو غلط نہیں ہوگا کہ اس اضافے پر داغ کی شاعری ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کی تصانیف اُردو شاعری کا ایک ایسا بیش بہا ذخیرہ ہے جس کی تازگی ہر دور میں محسوس کی جاتی رہے گی۔

(۱) گلزارِ داغ —— یہ داغ کے کلام کا پہلا مجموعہ ہے۔ ۱۲۹۶ھ مطابق ۱۸۷۸ء میں شائع ہوا۔ مطبع انوار محمدی لکھنو۔ اس مجموعہ میں ۳۸۹ غزلیں، ۷ رباعیاں، ۶ مخمسات، ا مسدس، ۲ قصائد اور ۲ تاریخی قطعات ہیں۔

(۲) آفتاب داغ —— یہ داغ کے کلام کا دوسرا مجموعہ ہے۔ جسے پہلی بار ۱۳۰۲ھ مطابق ۱۸۸۴ء میں منشی تیغ بہادر انوار الاخبار لکھنو سے شائع کرایا۔ اس مجموعہ میں ۱۲۹ غزلیں اور ۱۸ رباعیاں ہیں۔

(۳) مہتاب داغ —— یہ داغ کے کلام کا تیسرا مجموعہ ہے۔ اسے پہلی بار ۳ر جمادی الاخرہ ۱۳۱۰ھ یعنی ۳ر دسمبر ۱۸۹۳ء کو شائع کرایا۔ مطبع عزیز دکن چھتہ بازار حیدر آباد۔ اس مجموعہ میں ۲۲۹ غزلیں، ۱۹ رباعیاں، ۲ مخمسات، ۶ قصائد، ۳۷ تاریخی قطعات، ۴ غیر تاریخی قطعات، ۴ سہرا، ۳ سلام اور ۱۲۰ متفرق اشعار ہیں۔

(۴) یادگار داغ —— یہ داغ کے کلام کا چوتھا مجموعہ ہے۔ ۱۳۲۳ھ مطابق نومبر ۱۹۰۵ء میں اسٹیم پریس لاہور سے شائع ہوا۔ اس مجموعہ میں ۱۶۵ غزلیں، ۸ رباعیاں، ۲ قصائد، ۳۴ تاریخی قطعات، ۳ غیر تاریخی قطعات، ۲ سہرا، ا سلام، ۱۰۸۸ متفرق اشعار شامل ہیں۔

(۵) فریاد داغ —— یہ داغ کی پہلی مثنوی ہے۔ جس میں اُنہوں نے منی بائی حجاب سے اپنے معاشقے کو نظم کے قالب میں ڈھالا ہے۔ اس مثنوی کو پہلی بار محمد امجد علی مالک اخبار نیر اعظم مراد آباد نے مطبع العلوم سے ۱۳۰۰ھ میں شائع کیا۔ یہ مثنوی ۱۱۸۳۸ اشعار پر مشتمل ہے۔

(۶) ضمیمہ یادگار داغ —— یہ یادگار داغ کا تتمہ ہے۔ لالہ سری رام مطبع مفید عام لاہور میں طبع ہوا۔ اس میں ۷۰ غزلیں اور ۳۰ متفرق اشعار، جس میں دو شعر قطع کے شامل ہیں۔

مذکورہ تصانیف کے علاوہ داغ کے دواوین کے انتخاب بھی شائع ہو چکے ہیں۔ جس کی

تفصیل درج ذیل ہے۔

(۱) انتخاب داغ —— یہ داغ کے کلام کا پہلا انتخاب ہے۔ یہ انتخاب ان کے تین دیوان پر مشتمل ہے۔ 'گلزار داغ'، 'آفتاب داغ' اور 'مہتاب داغ' انوار محمدی نے لکھنو سے شائع کرایا ہے۔

(۲) کمال داغ —— یہ داغ کے کل کلام (غزل) کا انتخاب ہے۔ مولانا حامد حسن قادری نے مرتب کیا اور آگرہ اخبار پریس آگرہ نے ۱۹۳۴ء کو شائع کیا۔

(۳) منتخب داغ —— یہ بھی داغ کے کل کلام کا انتخاب ہے۔ مولانا احسن مارہروی نے ترتیب دیا۔ انوار احمدی پریس الہٰ آباد سے شائع ہوا۔

داغ کی پرورش لاقلعہ میں ہوئی جہاں رنگینیاں ورعنایاں اپنے شباب پر تھیں۔ انسانی جبلت کا تقاضا ہے کہ اسے آرام وآسایش میں خدا کی یاد کم آتی ہے۔ مگر داغ عیش پسندانہ ماحول میں پروان چڑھنے کے باوجود خدا اور اس کے احکام سے کبھی غافل نہیں ہوئے۔ یہ خدا کے خوف کا ہی نتیجہ تھا کہ اُنہوں نے شراب کو کبھی منہ نہیں لگایا۔ اس بات کی تصدیق مولانا احسن مارہروی نے بھی کی ہے۔ خود داغ نے بھی اس طرف اشارہ کیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

گو ہے عاشق مزاج و شاہد باز
داغ لیکن شراب خوار نہیں

پانچوں وقت کی نماز ادا کرنا داغ کے معمولات میں شامل تھا۔ خواہ آرام کر رہے ہوں یا کسی دوسرے ضروری کام میں مشغول ہوں۔ نماز کے اوقات میں نماز ضرور ادا کرتے تھے۔ جناب نوح ناروی اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں۔

"حضرت داغ نماز صبح پڑھنے کے بعد آفتاب نکلتے نکلتے گرمی کے زمانے میں معمولاً اپنی کوٹھی کے پھاٹک کے قریب اندرونی جانب آرام کرسی پر بیٹھ جاتے ...... گیارہ بجے دن کے قریب کوٹھی کے اندرونی حصے میں دستر خوان بچھتا، جو لوگ موجود ہوتے سب کھانے میں شریک کئے جاتے ......تناول طعام کے بعد حضرت داغ کے

سامنے پیچوان لگا دیا جاتا...... پھر استاد گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ آرام کے بعد ظہر کی نماز ادا کرتے اور شطرنج کی دو ایک بازی کھیلتے...... عصر کی نماز کے بعد ہواخوری کے لئے جوڑی پر سوار ہوکر نہایت تزک و احتشام کے ساتھ نکلتے...... کچھ دیر تک تفریح فرما کر واپس آتے اور مغرب کی نماز پڑھتے...... پھر رات کا کھانا تناول فرماتے۔ عشاً کی نماز کے بعد خود شعر کہتے۔''

('نگار'، جنوری۔فروری ۱۹۵۳ء، صفحہ ۲۸ تا ۲۹)

خدا سے عقیدت کی پختگی کا عالم یہ تھا کہ داغ حج بیت اللہ کی زیارت کا شرف حاصل کر چکے تھے۔ ۱۸۷۲ء میں اُنہوں نے یہ فریضہ انجام دیا۔ 'فریادِ داغ' میں جو قطعہ تحریر ہے اس سے مذکورہ بات کی تصدیق ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اُنہیں جو مختلف خطابات سے نوازا گیا ہے اس پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ ملاحظہ ہو :

حاجی نواب مرزا خاں داغ دہلوی!!
وہ جہاں استاد شاگردوں میں جس کے بادشاہ
شاعری نامی دبیر الدولہ ناظم یار جنگ
بلبل ہند و فصیح الملک تھے بے اشتباہ

('فریادِ داغ'، صفحہ ۲۴۸)

داغ نے جس رنگ کی شاعری سے شہرت حاصل کی اس زمانے میں شاعروں کا محبوب مشغلہ اور عام رنگ تھا لیکن جو شہرت اور مقبولیت داغ کے حصے میں آئی وہ کسی اور کو نصیب نہیں ہوئی۔ جلال لکھنوی، امیر، تسلیم لکھنوی، منیر شکوہ آبادی وغیرہ داغ کے معاصرین تھے۔ مگر شہرت کے معاملے میں داغ ان سب پر فوقیت رکھتے تھے۔ کوچہ و بازار اور محافل و رقص سرود میں ہر جگہ داغ ہی کا سکہ چلتا تھا۔ آپ ہی کی غزلوں پر دنیا سر دھنتی تھی۔ جناب نوح ناروی اس ضمن میں رقم طراز ہیں :

''مجھ سے رام پور کے اس مشاعرہ میں جو نمائش کے موقع پر ہوا تھا ایک سن رسیدہ صاحب نے ذکر کیا کہ نواب خلد آشیاں یعنی

نواب کلب علی خاں صاحب کا معمول تھا کہ مشاعرے کے باہر کچھ لوگوں کو اس خیال سے بیٹھا دیتے تھے کہ بعد ختم مشاعرہ لوگ کس کا شعر پڑھتے ہوئے مشاعرے سے باہر نکلتے ہیں چنانچہ ہمیشہ یہی ہوتا تھا کہ داغؔ صاحب کا شعر پڑھتے ہوئے لوگ اپنے اپنے گھروں کو جاتے تھے۔''

('نگار'، جنوری۔فروری ۱۹۵۳ء، صفحہ ۲۵ تا ۲۶)

مزید روشنی ڈالتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''ایک بار منشی منیر شکوہ آبادی نے سر دربار حضرت داغؔ دہلوی کا دامن تھام کر کہا کہ کیا تمہارے شعر میرے شعر سے اچھے ہوتے ہیں مگر اس کا کیا سبب ہے کہ تمہارے شعر لوگوں کی زبان پر رہ جاتے ہیں اور میرے شعروں پر لوگوں کی خاص توجہ نہیں ہوتی ہے نہ کوئی یاد رکھتا ہے۔اس پر جناب امیر مینائی نے فرمایا یہ خداداد مقبولیت ہے اس پر کسی کا بس نہیں ہوتا۔''

('یادگار داغؔ'، صفحہ ۱)

یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ داغؔ کے ہم عصر اور زبردست حریف امیرؔ مینائی جن کا علم داغؔ کے علم سے کہیں زیادہ تھا فن محاسن میں کم نہ تھے۔لیکن داغؔ کی مقبولیت اور شہرت ہی سے متاثر ہو کر اور لوگوں کی مخالفت کو یکسر نظر انداز کر کے داغؔ کے رنگ میں شعر کہنے لگے۔اُنہوں نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنے اشعار میں داغؔ کی عظمت کا نہ صرف اعتراف کیا ہے بلکہ ان کی محبت سے محروم ہونے کا گلہ بھی کیا ہے۔ملاحظہ ہو:

امیر اچھی غزل ہے داغؔ کی جس کا یہ مصرع ہے
بھویں تنتی ہیں خنجر ہاتھ میں ہے تن کے بیٹھے ہیں

کہاں ہم اے امیرؔ اب اور کہاں داغؔ
وہ جلسے ہو چکے خلد آشیاں تک

جب سے سنا ہے امیرؔ کہ ہیں داغؔ دردمند
لاکھوں پڑے ہیں سینہ اہل سخن میں داغ

شاعرِ مشرق علامہ اقبال نے بھی داغؔ کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کیا ہے۔جس سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے رنگ کے موجد بھی تھے اور خاتم بھی۔ ملاحظہ ہو۔

اب کہاں وہ بانکپن وہ شوخی طرز بیاں
آگ تھی کافور پیری میں جوانی کی نہاں

ہو بہو کھینچے گا لیکن عشق کی تصویر کون
اُٹھ گیا ناوک فگن مارے گا دل پر تیر کون

مذکورہ باتوں سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ داغؔ کا شماران شاعروں میں ہے۔جس نے اپنی حیات ہی میں مقبولیت کی وہ منزلیں طے کیں جو دوسرے شاعروں کے حصّے میں کم آئیں۔غالبؔ کو دورِ جدید کا بڑا شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔دیوانِ غالبؔ کو الہامی کتاب کہنے سے بھی گریز نہیں کیا گیا مگر وہ بھی اپنے دور کو اپنی راہ پر نہ چلا سکے۔جب کہ داغؔ نے اپنے دور کو اپنی شعری روش پر چلنے کو مائل کیا۔ بقول احسن مارہروی

''اُردو کے باکمال شعراء میں آپ (داغؔ) ہی پہلے بزرگ تھے۔جس نے اپنی حیات میں امید سے زیادہ شہرت وناموری حاصل کی۔''
('یادگار داغؔ'، صفحہ ۱)

داغؔ کی شاعری کی سب سے بڑی خوبی زبان کی صفائی اور محاورات کی درستگی و برجستگی ہے۔داغؔ کی اس خوبی کا اعتراف غالبؔ نے بھی کیا ہے۔جس کے متعلق محمد نثار علی شہرت رقم طراز ہیں :

''میں نے ادب کے ساتھ گذارش کی کہ داغؔ کی اُردو کیسی ہے؟ فرمانے لگے ایسی عمدہ ہے کہ کسی کی کیا ہوگی۔ذوق نے اُردو کو اپنی گود میں پالا تھا داغؔ اس کو نہ فقط پال رہا ہے بلکہ اس کو تعلیم دے

رہا ہے۔''

('آئینہ داغ'، صفحہ ۳۴)

تاج جس قدر جواہرات سے آویزاں ہوگا اسی قدر حسین اور دلکش معلوم ہوگا۔ یہی حال شاعری کا ہے۔ اگر شاعر کو زبان پر قدرت حاصل ہے تو اس کا کلام ہر دور میں تازہ اور دلکش رہے گا۔ ذوقؔ زبان و محاورات کے شاعر تھے اور بقول غالبؔ ''ذوقؔ نے اُردو کو اپنی گود میں پالا تھا، ایسے باکمال استاد سے اصلاح لینے والا باکمال ہی تو ہوگا۔ اور ایسے ہی باکمالوں میں داغؔ کا شمار ہوتا ہے۔ جنہوں نے اپنی زبان کی بدولت غزل میں ایک نئی روح پھونک دی۔ وہ زبان و بیان کی پرکھ کا فطری مذاق رکھتے تھے جس پر اُنہیں فخر تھا۔ اس کا اظہار اُنہوں نے اپنے کئی اشعار میں بھی کیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

اُردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں
ہندوستان میں دھوم ہماری زبان کی ہے

اللہ اللہ تیری شوخ بیانی اے داغؔ
ست اک شعر نہ دیکھا ترے دیوان میں کبھی

داغؔ سا بھی کوئی شاعر ہے ذرا سچ کہنا
جس کے ہر شعر میں ترکیب نئی پاتے ہیں

داغؔ کے کلام پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو اس میں شعری لب و لہجہ کی شوخی نمایاں پاتے ہیں۔ یوں تو اُردو شاعری میں شوخی کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ داغؔ سے قبل اور ان کے زمانے میں بھی کم و بیش ہر شاعر کے کلام میں شوخی کا عنصر پایا جاتا ہے مگر اس شوخی میں آوردگی کا گمان ہوتا ہے۔ اس کے برعکس داغؔ کے کلام میں جو شوخی پائی جاتی ہے وہ بالکل فطری معلوم ہوتی ہے۔ چونکہ داغؔ کی پرورش قلعہ معلیٰ میں ہوئی تھی۔ لہٰذا اُنہیں کبھی کسی چیز کی تنگی کا احساس نہیں ہوا۔ قلعہ کی رعنائیاں، رنگینیاں و جنسی بے راہ روی کے دھارے

سے اُنہوں نے صرف وضو پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ غوطہ بھی لگایا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار میں شوخی وظرافت اور بانکپن کا رنگ نہ صرف نکھرا ہوا ہے بلکہ اپنے شباب پر ہے۔ واعظ، زاہد، ناصح، محبوب، خدا حتیٰ کہ خود سے بھی چھیڑ چھاڑ کیا ہے۔ جس میں بے تکلفی بھی ہے اور بے ساختگی بھی۔ ملاحظہ ہو۔

دیکھنا پیر مغاں حضرت واعظ تو نہیں
کوئی بیٹھا نظر آتا ہے پس خم مجھ کو

خوب پردہ ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں
صاف چھپتے بھی نہیں، سامنے آتے بھی نہیں

دیکھو ادھر، اٹھاؤ نظر، ہو چکی حیا
کیا جانتا نہیں ہے کوئی اتنی بات کو

اس قدر ناز ہے کیوں آپ کو یکتائی کا
دوسرا نام ہے وہ بھی میری تنہائی کا

تمہارے خط میں نیا اک سلام کس کا تھا
نہ تھا رقیب تو آخر وہ نام کس کا تھا

خاطر سے یا لحاظ سے میں مان تو گیا
جھوٹی قسم سے آپ کا ایمان تو گیا

داغؔ نے اپنے کلام میں محاورات کا استعمال بڑی فنکاری اور مہارت سے کیا ہے۔ اُنہوں نے دہلی کی ٹکسالی زبان خصوصاً قلعہ معلیٰ کی زبان اور محاوروں کو اپنے کلام میں بڑے اہتمام سے باندھا ہے اُنہیں بول چال کی زبان پر جیسی قدرت حاصل تھی ویسی

قدرت کسی دوسرے شاعر کے کلام میں دور دور تک نظر نہیں آتی ۔ یہ صحیح ہے کہ ان کے کلام میں ایسے اشعار بھی مل جاتے ہیں جس میں فقط محاورہ بندی کا شوق نمایاں ہے ۔ ایسے اشعار کی تعداد خال خال ہے ۔ بحثیت مجموعی ایسا محسوس نہیں ہوتا کہ ان کے اشعار محاورے کے مرہون منت ہیں بلکہ ایسا لگتا ہے کہ محاورے ان کے اشعار کے مرہون منت ہیں ۔ داغؔ اس خصوصیت میں دورِ آخر کے متغزلین میں ایک منفرد مقام رکھتے ہیں ۔ ولی احمد خاں نے چار ہزار چار سو چونسٹھ (۴۴۶۴) محاورات کی نشاندہی کی ہے ۔ اس سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اُنہیں محاورہ بندی پر کس قدر قدرت حاصل تھی ۔ انہوں نے اپنے کلام میں محاوروں کو اس بے ساختگی سے باندھا ہے کہ محاورات پر بات چیت کا گمان ہوتا ہے ۔ چند اشعار رقم کیے جاتے ہیں ۔ ملاحظہ ہو ۔

اس شوخ و دغاباز کا کھلتا نہیں کچھ بھید
جب تک اُسے باتوں میں ٹٹولا نہیں جاتا

غیر کی محفل میں مجھ کو مثل شمع
آٹھ آٹھ آنسو رلایا آپ نے

کب شرارت سے باز آتے ہیں
آگ پانی میں وہ لگاتے ہیں

تکرار الفاظ کو ایک عیب مانا جاتا ہے جس سے عبارت بوجھل ہو جاتی ہے ۔ اس کے برعکس داغؔ اپنے کلام میں تکرار الفاظ سے ایک سماں باندھ دیتے ہیں اور قاری داد دیئے بغیر نہیں رہ پاتا ۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ انہوں نے اس عیب کو ہنر بنا دیا ہے ۔ اس سلسلے میں چند اشعار پیش خدمت ہیں ۔ ملاحظہ ہو ۔

تیرے ظلم پنہاں ابھی کون جانے
فقط آسمان آسماں ہو رہا ہے

کیا قاصد نافہم کو میں باندھ کر بھیجوں
وہ تو نہیں جاتا نہیں جاتا نہیں جاتا

داغؔ سے قبل اردو شاعری میں عاشق اپنے محبوب کے مقابلے ایک قسم کے احساسِ کمتری کا شکار تھا۔ اسے عشق میں اپنے محبوب سے ہمیشہ ہزیمت اٹھانی پڑتی تھی۔ اس کے باوجود اس کی پیشانی پر بل نہیں پڑتا تھا گرچہ محبوب کی ٹھوکروں سے پامال ہوتا تھا مگر زبان سے اُف نہیں کہتا تھا۔ بقول غالبؔ ''گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا''۔ داغؔ نے اس بدعت کو بری طرح پامال کیا اور عاشقوں کو احساس کمتری سے نکالا۔ چند اشعار دیکھئے۔

آپ کے سر کی قسم داغؔ کو پروا بھی نہیں
آپ کے ملنے کا ہوگا جسے ارماں ہوگا

اک نہ اک لگائے رکھتے ہیں
تم نہ ملتے تو دوسرا ملتا

یہ کیا کہا کہ اے داغؔ تو ہے کس شمار میں
یکتا ہوں میں ہزار میں کیا سو ہزار میں

ہم لطف کے بندے ہیں خدا کی قسم اے واعظ
ہم سے نہ کبھی ناز ستم گر کے اٹھیں گے

غزل میں تجربات و مشاہدات کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ خاص کر حسن و عشق کی دنیا میں جو پیش آئے ہوں۔ داغؔ کی شاعری کو اگر ان کے ذاتی تجربات کا نچوڑ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا۔ آپ کے کلام میں ایسے اشعار کی کمی نہیں جسے پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ شعر میں جو بات کہی گئی ہے وہ سنی سنائی نہیں ہے بلکہ شاعر اُن حالات سے خود گزرا ہے۔ جس کے نتیجے میں اشعار معرض وجود میں آئے۔ جب دھڑکتا ہوا انسانی دل کسی کے

عشق میں گرفتار ہو جاتا ہے تو نہ صرف عاشق کے دل کی دھڑکنیں بڑھ جاتی ہیں بلکہ اس کے حافظے کی کیفیت بھی کچھ ایسی ہی ہو جاتی ہے ۔

آتی ہے بات بات مجھے یاد بار بار
کہتا ہوں دوڑ دوڑ کے قاصد سے راہ میں

مذکورہ شعر جس کیفیت کی غمازی کرتا ہے اس سے عاشق اکثر دوچار ہوتا رہتا ہے۔ مزید چند اشعار پیش خدمت ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

خدا جانے کہے کیا جا کے قاصد
دل اس سے پیشتر جائے تو اچھا ہے

لڑتی جاتی ہے غیر سے بھی آنکھ
تجھ سے بھی بات کرتے جاتے ہیں

داغ کو اظہار خیال پر بھی قدرت حاصل تھی۔ مشکل اور نازک مضمون کو آسان الفاظ میں ادا کر دینے میں ان کو ید طولیٰ حاصل تھا۔ چنانچہ ان کے اکثر و بیشتر اشعار سہل ممتنع کی اچھی مثال ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

ذکر میرا اگر آجاتا ہے
سن کے وہ صاف اڑا جاتا ہے

نہ تھی تاب اے دل تو کیوں چاہ کی
بڑا تیر مارا اگر آہ کی

کب تیری بات کا انتخاب نہیں
اس نہیں، کا مگر جواب نہیں

مختصر یہ کہ داغ ایک فطری شاعر تھے۔ انہوں نے اردو غزل کو جو دلکشی بخشی اس کی مثالیں کم ملتی ہیں۔ اردو شاعری میں بے ساختگی، بے تکلفی، حسن و عشق کی وارداتوں اور

معاملات عشق کی سچی ترجمانی کا جب بھی ذکر ہوگا تو داغ کا نام سب سے پہلے لیا جائے گا۔ داغ کو زبان و بیان پر قدرت حاصل تھی طرز ادا میں شوخی و بانکپن کے ساتھ خیال کی ندرت اور اظہار پر قدرت کی وجہ سے داغ ایک کامیاب غزل گو کی صف میں نظر آتے ہیں۔
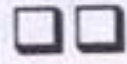
□□

صنف قصیدہ اور اس کے لوازم

قصیدہ عربی شاعری سے فارسی شاعری میں داخل ہوا اور پھر اردو شاعری میں آیا۔ عربی زبان میں قصیدہ کے لغوی معنی مغز غلیظ وسطبر کے ہیں۔ سطبر دلوار گودا کو کہتے ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ قصیدہ لفظ قصد سے نکلا ہے جس کے لغوی معنی ارادہ کرنا، کے ہیں۔ اصطلاحاً قصیدہ اس مسلسل نظم کو کہتے ہیں جس کے پہلے شعر کے دونوں مصرعے اور بقیہ اشعار کے دوسرے مصرعے ہم قافیہ وہم ردیف ہوتے ہیں۔

اہل قلم حضرات نے قصیدہ کی مختلف تعریفیں کی ہیں جن میں چند اہم یہ ہیں :-

پروفیسر الف کرنے کوا نسائیکلو پیڈیا آف سلام میں لکھتے ہیں :-

> ''قصیدہ عربی وفارسی اور ترک منظومات کی ایک صنف کا نام ہے جو کسی قدر طویل ہے۔ یہ لفظ عربی مادہ قصد سے مشتق ہے۔ جس کے معنی ارادہ کرنا......''

مقدمہ دیوان جوشش میں جوشش عظیم آبادی نے قصیدہ کی تعریف یوں کی ہے:-

> ''مطلع اور اشعار کی تعداد سولہ سے کم نہ ہو۔''

'کاشف الحقائق' جلد دوم میں امداد امام اثر یوں رقم طراز ہیں :-

> ''جس طرح غزل پانچ اشعار سے کم نہیں ہوتی اسی طرح قصیدہ اکیس شعر سے کم کا نہیں ہوتا ہے۔''

'المنجد' عربی کی ایک جدید لغت ہے جس میں قصیدے کی تعریف اس طرح کی گئی ہے :-

''قصیدہ وہ ہے جو سات یا دس شعر سے تجاوز کر جائے۔''

مذکورہ بالا تعریفوں پر جب ہم غور کرتے ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اشعار کی تعداد کسی نے تین بتائی کسی نے سات یا دس، کسی نے سولہ اور اکیس۔ اس کے علاوہ اشعار کی تعداد زیادہ سے زیادہ ہونے کے بارے میں لوگوں کے خیالات میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض اہل قلم حضرات نے زیادہ سے زیادہ اشعار کی تعداد سو بتلائی تو کسی نے ایک سو بیس اور کسی نے ایک سو ستر۔ کچھ قصائد ایسے بھی ملتے ہیں جو دو سو بیس اشعار پر مشتمل ہیں۔ مثلاً نصرتی کا قصیدہ، قدر بلگرامی کا قصیدہ، 'موسوم بہ آئینۂ محبوب' جس میں اشعار کی تعداد آٹھ سو سے زیادہ ہیں۔

عموماً قصیدے کا پہلا شعر مطلع کہلاتا ہے مگر یہ درمیان میں بھی ہو سکتا ہے۔ اس کی تعداد کی کوئی قید نہیں۔ بعض شاعروں نے پانچ مطلعے بھی کہے ہیں۔ جس قصیدے میں دو مطلعے ہوتے ہیں اسے دو مطلعین کہتے ہیں اور ایسے قصیدے جو دو مطلعوں سے تجاوز کر جائیں اسے ذوالمطالعے کہتے ہیں۔

ابتدائی عربی قصیدے میں ذاتی تجربات، شعرا کی روزمرہ کی زندگی، مناظر فطرت اور واردات عشق وغیرہ کا بیان کثرت سے ملتا ہے۔ چونکہ اس وقت کے شعراء بہت غیرت مند ہوا کرتے تھے اس لئے مدح وستائش صلہ وانعام کی خواہش سے بے نیاز ہو کر قصیدہ کہا کرتے تھے۔ مگر یہ بے نیازی زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکی اور صلہ وانعام کے حصول کا جذبہ کارفرما ہو گیا۔

......اسی دوران فارسی میں قصیدہ گوئی کی ابتدا ہوئی جس کی بنیاد امرا وسلاطین کی مدح وستائش سے صلہ وانعام کی خواہش وابستہ تھی۔ مدح سے مطلب برآوری نہ ہوتی تو ہجو کی طرف رجوع کرتے۔ مختصر یہ کہ اردو تک پہنچنے سے پہلے قصیدے کا اصل موضوع مدح یا ہجو کی شکل میں متعین ہو چکا تھا۔ اردو میں اس کی پیروی کی گئی مگر اس کے برخلاف کچھ قصائد ایسے بھی ملتے ہیں جن کا موضوع نہ تو مدح ہے اور نہ ہجو مثلاً علیم دہلوی کا ایک

قصیدہ ہے جس میں موصوف نے شعراء کے حالات کا ذکر کیا ہے اور سوداؔ نے اپنے ایک قصیدے میں جنگ کا حال قلم بند کیا ہے۔

اقسام قصیدہ

(۱) مقتضب :- ایسے قصیدے تشبیب اور گریز کی پابندی سے مبرا ہوتے ہیں۔

(۲) مشبب قصیدے میں تشبیب اور گریز کی پابندی ناگزیر ہے اس کے چار اجزا ہوتے ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں:-

(الف) تشبیب (ب) گریز (ج) مدح (د) دعاء

(الف) تشبیب یا نسیب چونکہ عربی شعراء اس میں عموماً عشقیہ اشعار قلم بند کرنے لگے اسی رعایت سے اسے تشبیب یا نسیب سے موسوم کیا گیا ہے۔ قصیدے کا یہ وہ حصہ ہے جس میں قصیدے کا آغاز ہوتا ہے۔ فارسی اور اردو قصیدے میں نہ صرف عشقیہ مضامین ہوا کرتے تھے بلکہ کیفیات شباب، واردات عشق، گردش چرخ، انقلاب زمانہ مناظر قدرت اخلاق و تصوف، علم وفنون، پند و موعظت، طعن و عریض، فخر و خودستائی وغیرہ قلم بند کئے جاتے تھے۔ ملاحظہ ہو۔

زلفیں یوں چہرے پہ بکھری ہوئی مانگے تھیں دل
جس طرح ایک کھلونے پہ ہٹیں دو بالک

مومنؔ

صبح ہوئی تو کیا ہوا ہے وہی تیرہ اختری
کثرت دود سے سیاہ شعلۂ شمع خاوری

مومنؔ

کروں میں اس کو مگر کیا کہ مشتری نہ رہے
متاع بخت کو بیچوں جو میں تو کس بازار

ذوقؔ

اکیلا ہو کے رہ دنیا میں گر چاہے بہت جینا
ہوئی ہے فیض تنہائی سے عمر خضر طولانی

سوداؔ

لڑکھراتی ہوئی چلتی ہے خیاباں میں نسیم
پاؤں رکھتی ہے صبا صحن میں گلشن کے سنبھل

سودا

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

سودا

بات میری جو کسی طرح سمجھتا ہی نہیں
رحم آتا ہے کہ ناصح بھی نہ ہو عاشق زار

مومن

تشبیب کے لئے مندجہ ذیل شرائط کا ہونا لازمی ہے :-

(الف) تشبیب میں نشاط انگیزی کی خصوصیت پائی جاتی ہے......نشاط انگیزی سے مراد سامع کا شاد ہونا لیکن یہ چیز بہاریہ اور عشقیہ تشبیب تک ہی محدود ہے۔ تشبیب میں جدت، ندرت اور رفعت کا ہونا ضروری ہے۔

(ب) دوسری شرط جو کافی اہم ہے وہ یہ ہے کہ تشبیب کے اشعار مدح کے اشعار سے کم ہوں۔ اگر ایسا نہیں ہے تو بعض نے اسے قصیدے کے معائب میں شمار کیا ہے چونکہ قصیدے کا اصل موضوع مدح طرازی تھا اس لئے تشبیب کے مضامین ضمنی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس بات کا خیال رکھتے ہوئے کہ تشبیب کے اشعار مدح کے اشعار سے کم ہوں۔ شعرائے اردو سے کہیں کہیں بے اعتنائی بھی ہوگئی ہے۔ مثلاً عزیزؔ لکھنوی کے بعض قصیدوں میں تشبیب کے مقابلے میں مدح مختصر ہے جسے انہوں نے شاہزادہ سلیمان شکوہ کی شان میں تحریر کیا ہے۔

(ج) گریز :- گریز قصیدے کا وہ حصّہ ہے جس کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ یہ تشبیب اور مدح کے دو مختلف حصّوں کو اس طرح جوڑتا ہے جس سے حسن اور دلکشی پیدا ہو جائے۔ گریز قصیدے کا مہتم بالشان حصّہ کہلاتا ہے اور شاعر کا کمال معیار سمجھا جاتا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:-

جو کچھ کیا ہے تو نے یہ تجھ کو سب مبارک
میں اور میرے سر پر میرا بسنت خاں ہو

سوداؔ

کب تک صفت بتوں کی خدا سے تو خوف کر
اے طبع رہ نہ اتنی بھی پابند خط و خال

پڑھ منقبت نہ شاہ کی جس سے نجات ہو
وہ شاہ جس سے ایک گدا کو یہ ہے کمال

میرؔ

گریز ایک شعر سے اور ایک سے زائد اشعار سے بھی کیا جا سکتا ہے عربی شعرائے متقدمین گریز کی طرف توجہ نہیں دیتے تھے مگر شعرائے متاخرین نے اس کو ایک مستقل فن بنا دیا۔ شعرائے فارسی کی تقلید کرتے ہوئے شعرائے اردو نے اسے ایک فن کی طرح برتا اور اس میں جدّت پیدا کی۔ مثلاً سوداؔ نے حضرت علیؓ کی مدح کے قصیدے بہاریہ تشبیب کے بعد اپنی شاعری کی رنگینی اور شیرینی کی تعریف کرتے ہوئے اس طرح سے گریز کیا ہے۔

ہے مجھے فیض سخن اس کی مداحی کا
ذات پر جس کے ممبران کہنہ عزوجل

(د) مدح قصیدے کا وہ جزو ہے جس کے لئے قصیدہ گو عام طور سے قصیدے کی عمارت کھڑی کرتا ہے۔ مدح میں دلکشی قائم رکھنے کے لئے الفاظ کا استعمال شان وشکوہ کے ساتھ ساتھ ممدوح کے حفظ مراتب پر بھی نظر رکھ کر ذکر کیا جاتا ہے۔ آسان لفظوں میں اس طرح کہہ سکتے ہیں...... بادشاہ کی تعریف کی جائے تو اس میں عدل وانصاف، جاہ و جلال، بہادری وجواں مردی، دولت وثروت اور سخاوت کا ہونا ضروری ہے۔ عالم دین یا مذہبی پیشوا کی مدح کی جائے تو فیوض و برکات، عبادت و ریاضت، کشف و کرامات، قناعت وخودداری کا تذکرہ ہونا چاہئے۔ حکیم اور فلسفی کے لئے تدبیر عظمت، علمیت و قابلیت ضروری ہے۔

سوداؔ نے اپنے قصیدوں میں ممدوح کی مناسبت سے تعریف و توصیف کی ہے۔ ملاحظہ ہو :

ہئیت عدل یہ تیری ہے کہ ہر دشت میں شیر
واسطے درد سر آہو کے گھسے ہے صندل

(ب) شجاع الدولہ کی تعریف میں یہ اشعار کس قدر ان کے شایان شان ہیں۔

جس جگہ تیری مروت کا زباں پر ہو ذکر
شعلہ واں جس کی اذیت کو سمجھتا ہے وبال

روز میداں قدم اپنا تو جہاں گاڑے ہے
کوہ کا سینہ پھٹے دیکھ ترا استقلال

مدح دو ضمنی اجزا میں منقسم ہے۔

(الف) مدح غائب...... گریز کے بعد پہلے ممدوح کی تعریف صیغہ غائب میں کی جاتی ہے۔ جس کو مدح غائب کہتے ہیں۔

(ب) مدح حاضر...... مدح حاضر میں براہ راست ممدوح کو خطاب کر کے تعریف کی جاتی ہے۔

(ج) دعا...... مشبب قصیدے کا آخری جزو دعا کہلاتا ہے قصیدے کی کامیابی کا دارومدار بہت حد تک اس پر ہے۔ کیونکہ اس کے بعد سلسلۂ کلام منقطع ہو جاتا ہے اور سامع کے ذہن پر یہی اشعار در آتے ہیں۔ چنانچہ اس موقع پر ممدوح کی نفسیات کا پورا پورا خیال رکھا جاتا ہے تاکہ اظہار مطالب سے اس کی طبیعت مکدر نہ ہو جائے۔ مثلاً سوداؔ اپنے قصیدے 'در مدح بسنت خاں' میں کہتے ہیں۔

لیکن نہ یہ سمجھو اس گفتگو سے ہرگز
منظور مجھ کو تیری ہمت کا امتحاں ہو

کس واسطے کہ مجھ کو اتنا ہی چاہئے ہے
جامہ ہو ایک بر میں کھانے کو نیم ناں ہو

سو تو زیادہ اس سے تیرا کرم ہے مجھ پر
کفران نعمت اوپر قادر نہ یہ زباں ہو

اتنی ہی آرزو ہے کچھ عمر ہو جو باقی
مصرف جہاں میں اس کا تیرے قدم کے یاں ہو'

غالبؔ سے پہلے شاعر دعا میں اپنے آپ کو مخاطب کر کے کہتا تھا، اب سلسلہ کلام کو دعائیہ پر ختم کرتا ہوں، اور پھر دعا دیتا تھا چونکہ اس طریقے کی کشش معدوم ہو چکی تھی اس لئے غالبؔ نے قصیدہ، 'مدح بہادر شاہ' میں مدح کے ساتھ ساتھ آخر کے ایک مصرے میں دعا شامل کر کے جدت اور لطافت کا حق ادا کیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

ہے ازل سے روانی آغاز
ہے ابد تک رسائی انجام

قصیدے کے اجزائے ترکیبی کو مطلع تخلص اور مقطع سے موسوم کیا جاتا ہے۔ مطلع سے مراد تشبیب، تخلص کے تحت گریز، مدح اور مقطع کے تحت دعا کا شمار۔

مضامین کو ملحوظ رکھا جائے تو قصیدہ کی چار قسمیں ہوتی ہیں۔

(الف) مدحیہ :- جس قصیدے میں کسی کی مدح کی جاتی ہے اسے مدحیہ کہتے ہیں۔

(ب) ہجویہ :- ہجویہ قصیدہ اسے کہتے ہیں جس میں کسی کی ہجو کی جائے۔

(ج) وعظیہ :- ایسے قصاید میں پند و موعظت نظم کئے جاتے ہیں۔

(د) بیانیہ :- اس قسم کے قصیدوں میں مختلف کیفیات نظم کئے جاتے ہیں۔ مثلاً موسم بہار، شہروں کی تباہی وغیرہ وغیرہ۔

ان تمام کے علاوہ قصیدے کی ایک قسم اور ہے جسے دعائیہ کہتے ہیں۔ اس میں شروع سے دعائیہ اشعار ہوتے ہیں۔

ممدوحین کے اعتبار سے قصیدے کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔

(الف) وہ قصیدے جو بزرگانِ دین کی شان میں کہے گئے۔

(ب) وہ قصیدے جو سلاطین و امراء کی مدح میں کہے گئے۔

ان سب کے علاوہ ایک قسم اور ہے جو ریختی کے طرز میں لکھے گئے۔

□□

میر انیسؔ

لکھنو کی سرزمین شروع سے مردم خیز رہی ہے۔ تمام اصناف سخن کی روایتوں کی تشکیل و آرائش یہاں ہوئی ہے لیکن صنف مرثیہ نے خاص طور پر اس سرزمین میں جلا پائی ہے۔ یوں تو ذخیرہ شاعری میں صنف مرثیہ کی قدیم ترین دکنی روایتیں موجود ہیں لیکن مرثیے کی ان قدیم روایتوں میں کوئی صنفی توانائی نہ تھی لکھنو کے مرثیہ گویوں نے اس صنف شاعری کے خط و خال کو سنوارنے کی غیر معمولی کاوشیں کیں۔ شروع میں یہاں بھی مرثیے مذہبی مواقع پر پڑھنے اور سنائے جانے ہی کے لئے لکھے جاتے تھے۔ اس کی کوشش کی جاتی تھی کہ رونے اور رلانے کے عناصر اور مواقع نمایاں رہیں تا کہ پڑھنے والے یا سننے والے کو ثواب گریہ حاصل ہو۔

اردو مرثیہ نگاری کی تاریخ میں میر انیسؔ کی شخصیت بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ انیسؔ نے یہ ذوقِ سخن اپنے اجداد سے ورثے میں حاصل کیا تھا۔ میر انیسؔ کی فنکارانہ عظمت کا اصل سبب یہ ہے کہ انہوں نے مرثیے کو ایک باضابطہ صنف سخن بنا دیا۔ میر انیسؔ سے پہلے مرثیے کو صنف سخن کی حیثیت سے کوئی امتیازی درجہ حاصل نہ تھا۔

میر انیسؔ میر مستحسن خلیق کے فرزند تھے۔ موخرالذکر ایک متقی و پرہیزگار بزرگ تھے۔ مرثیہ گوئی سے دلچسپی رکھتے تھے اور اسے ذریعہ نجات تصور کرتے تھے وہ مجالس کرنے مرثیہ پڑھنے سنانے اور حسینؑ کے غم میں آہ وزاری اور بین و ماتم کو عبادت کا لازمی

جزو سمجھتے تھے۔ میر انیسؔ نے اسی ماحول میں آنکھیں کھولیں اور والد بزرگوار کے قائم کردہ اصولوں پر کاربند ہو گئے۔

میر خلیق ہی کے دور میں میر ضمیر نے مرثیہ نگاری میں نئی نئی راہیں اختراع کیں اور اپنے شاعرانہ جوہر کا مظاہرہ شروع کیا۔ میر خلیق کی شدید خواہش تھی کہ ان کا فرزند مرثیہ نگاری کے میدان میں میر ضمیر سے بھی آگے نکل جائے تاکہ خود انہیں بھی شہرت حاصل ہو۔ چنانچہ میر انیسؔ کو مرثیہ گوئی کی طرف مائل کرنے میں انہوں نے اہم رول ادا کیا۔

لکھنؤ اس وقت نواب اور امراء کا مرکز تھا...... تعیش پسندی کے باوجود مذہب کو اتنا دخل ضرور تھا کہ لوگ اسے شان و شوکت کے اظہار کا بہترین وسیلہ سمجھتے تھے۔ چنانچہ شعراء کو یہاں بھاری وظائف سے نوازا بھی جاتا تھا تاکہ چہلم کے موقع پر بہتر سے بہتر مرثیے لکھے اور پڑھے جائیں۔

''تذکرہ شعرائے اردو'' میں میر حسن نے مراثی سے شغف رکھنے والے بہت سے شاعروں کا ذکر کیا ہے۔ جس میں میر امانی درخشاںؔ، میر آل علی، صبرؔ، سکندرؔ، قادر، کمانؔ اور ندیمؔ قابل ذکر ہیں۔ ان سب کے علاوہ میر تقی میرؔ، ضاحکؔ، میر حسنؔ نے بھی مرثیے لکھے لیکن انہیں کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں ہو سکی۔ سودا مرثیے کی مسدس ہیت کے موجد ہیں لیکن فنی طور پر ان کی کوئی خاص قدر و قیمت نہیں ہے۔ جن لوگوں نے اس صنف کو اہم فنی قدروں سے آشنا کیا ان میں مرزا دبیر اور ان سے بھی زیادہ میر انیسؔ ممتاز حیثیت کے حامل ہیں۔ میر انیسؔ دراصل ان خوش نصیب شاعروں میں ہیں جنہیں ان کی زندگی میں ہی شہرت و مقبولیت کا درجۂ کمال حاصل ہو گیا۔ بقول اثرؔ لکھنوی :-

> ''انیسؔ کے کلام کی مقبولیت کا یہ حال تھا کہ مرثیے پڑھے نہیں کہ پورے کے پورے بند لوگوں کو یاد ہو گئے اور احباب کو جو مجلس میں شریک نہ تھے سنائے جانے لگے اور موافقت اور مخالفت میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ میر صاحب کے مداحوں میں بعض کا حافظہ اس بلا کا تھا کہ پورا مرثیہ دوران خواندگی میں ازبر ہو جاتا تھا۔ گھر

پہونچتے ضبط تحریر میں لائے اور دیگر شائقین نے نقلیں حاصل کرنے
کا تانتا باندھ دیا۔"
('انیس کی مرثیہ نگاری'، صفحہ ۱۲)

شبلی کلام انیسؔ کی خصوصیات کی نشاندہی کرتے ہوئے رقم طراز ہیں :-

"میر انیسؔ کے کمال شاعری کا بڑا جوہر یہ ہے کہ باوجود اس کے کہ
انہوں نے اردو شعراء میں سب سے زیادہ الفاظ استعمال کئے اور
سینکڑوں مختلف واقعات بیان کرنے کی وجہ سے ہر قسم اور ہر درجہ
کے الفاظ استعمال کرنے پڑے۔ تاہم ان کے کلام میں غیر فصیح
الفاظ نہایت کم پائے جاتے ہیں۔"
('موازنہ انیسؔ و دبیرؔ'، صفحہ ۲۷)

خود انیسؔ کو شاعری کے فنی تقاضوں کا جو واضح شعور تھا اسے درج ذیل شعروں
میں ملاحظہ کیجئے۔

ہے کجی عیب مگر حسن ہے ابرو کے لئے
سرمہ زیبا ہے فقط نرگس جادو کے لئے
تیرگی بد ہے مگر نیک ہے گیسو کے لئے
زیب ہے خال سیہ چہرۂ گلرو کے لئے

داند آں کس کہ فصاحت بکلامے دارد
ہر سخن موقع و ہر نکتہ مقامے دارد

میر انیسؔ کے کلام کی ایک اہم خوبی منظر نگاری ہے وہ فنی رموز سے واقف ہی
نہیں بلکہ شعری کیفیتوں کو برتنے کا پورا سلیقہ رکھتے ہیں۔ خواہ گرمی کے سماں کا ذکر ہو یا آمد
صبح کی کیفیت کا بیان، میر انیسؔ قدرت کے مناظر کو جس فنکاری سے پیش کرتے ہیں یہ
انہیں کا کمال ہے۔ مثال کے طور پر میر انیسؔ نے جس فنکارانہ طریقے سے گرمی کا نقشہ کھینچا
ہے، ملاحظہ ہو۔

وہ لو، وہ آفتاب کی حدت وہ تاب و تب
کالا تھا رنگ، دھوپ سے دن کا مثال شب
خود نہر علقمہ کے بھی سوکھے ہوئے تھے لب
خیمے جو تھے حبابوں کے تپتے تھے سب کے سب
اڑتی تھی خاک خشک تھا چشمہ حیات کا
کھولا ہوا تھا دھوپ سے پانی فرات کا

شیر اٹھتے تھے نہ دھوپ کے مارے کچھار سے
آہو نہ منہ نکالتے تھے سبزہ زار سے
آئینہ مہر کا تھا مکدر غبار سے
گردوں کو تپ چڑھی تھی زمین کے بخار سے
گرمی سے مضطرب تھا زمانہ زمین پر
بھن جاتا تھا جو گرتا تھا دانہ زمین پر

گرداب پر تھا شعلہ جوالہ کا گمان
انگارے تھے حباب تو پانی شرر فشاں
منہ سے نکل پڑی تھی ہر اک موج کی زبان
تہہ میں تھے سب نہنگ مگر تھی لبوں پہ جاں
پانی تھا آگ گرمی روز حساب تھی
ماہی جو سیخ موج تک آئی کباب تھی

میر انیسؔ کی قدرت بیان کی وضاحت کرتے ہوئے شبلیؔ لکھتے ہیں:-

''میر انیسؔ نے اگرچہ اس صنف (منظر نگاری) پر صرف دو تین مرثیے لکھے ہیں لیکن جو لکھا ہے کمال کے درجے پر پہنچا دیا ہے۔''

انہوں نے مزید لکھا ہے:-

''میر انیسؔ نے شاعری کی اس صنف (منظر نگاری) کو جس کمال تک پہنچایا اُردو کیا فارسی میں بھی اس کی بہت کم مثالیں ملتی ہیں۔''

('موازنہ انیس و دبیر' صفحہ ۱۴۵ اور ۱۴۱)

میر انیسؔ کی جذبات نگاری کے بارے میں ڈاکٹر سید اعجاز حسین نے اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے :-

''جذبات برآنگیختہ کرنے کے لئے الفاظ کو بہترین موقعے سے صرف کرنے کے علاوہ نفسیات کو متحرک کرنے والے اثرات و انداز گفتگو جس فنکارانہ حیثیت سے میر انیسؔ کلام میں لاتے ہیں اس کی مثال اردو شاعری میں اب تک نہیں ملتی۔''

('مذہب اور شاعری' صفحہ ۲۶۹)

واقعہ نگاری میں بھی میر انیسؔ نے اپنی ایک الگ چھاپ چھوڑی ہے۔ واقعہ خواہ کسی قسم کا ہو انہوں نے اس کی ایسی تصویر کشی کی کہ اس سے بہترین مصوری ناممکن نظر آتی ہے۔ رام بابو سکسینہ رقم طراز ہیں :-

''معرکہ جنگ میں مبازوں کی رجز خوانی، حریف کا جواب، حملہ آوروں کے حملے، پہلوانوں کی لڑائیاں، سامان حرب وضرب اعلیٰ قدر، مراتب اس خوبی سے دکھاتے ہیں کہ میدان کارزار کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے تلوار اور گھوڑے کی تعریف صدہا بلکہ ہزارہا جگہ کی گئی ہے مگر ہر دفعہ تشبیہہ اور تخیل نئی ہوتی اور نیا لطف دیتی ہے۔''

('تاریخ ادب اردو' صفحہ ۳۲۱)

گھوڑے کے غیظ اور اس کی تیزی کا حال میر انیسؔ کی زبانی ان لفظوں میں ملاحظہ فرمائیں ۔

مانند شیر غیظ میں آیا وہ پیل تن
آنکھیں اُبل پڑیں صفتِ آہوئے ختن
ماری زمیں پہ ٹاپ کہ لرزا تمام بن
غل پڑ گیا کہ گھوڑے پہ بھی لو چڑھا ہے رن
میخیں زمیں کی اس کی تگ و پو سے ہل گئیں
دونوں کنوتیاں بھی کھڑی ہو کے مل گئیں

سمٹا، جما، اڑا، اِدھر آیا اُدھر گیا
چمکا پھرا جمال دکھایا، ٹھہر گیا
تیروں سے اڑ کے برچھیوں میں بے خطر گیا
برہم کیا صفوں کو پرے سے گزر گیا
گھوڑوں کا تن بھی ٹاپ سے اس کے فگار تھا
ضربت تھی لعل کی کہ سروہی کا وار تھا

پھرتا تھا کیا، صفوں میں فرس جھوم جھوم کے
سرعت بلائیں لیتی تھی چوم چوم کے
پامال تھے پرے سپہ شام و روم کے
غل تھا یہ غول میں پسر سعد شوم کے
رخش ایسا روم ورے میں نہیں شام میں نہیں
یہ شوخیاں تو ابلق ایام میں نہیں

بجلی کبھی بنا، کبھی رہوار بن گیا
آیا عرق تو ابر گہربار بن گیا
گہ قطب گاہ گنبد دوّار بن گیا
نقطہ کبھی بنا کبھی پُرکار بن گیا

حیران تھے اس کے گشت پہ لوگ اس ہجوم کے
تھوڑی سی جا میں پھرتا تھا کیا جھوم جھوم کے

میر انیسؔ کی قادر الکلامی کا ہی نتیجہ ہے کہ واقعہ نگاری میں بہت چھوٹی چھوٹی چیزوں کا بھی انہوں نے ذکر کیا ہے مگر اس کے باوجود مرثیوں میں کہیں سطحیت پیدا نہیں ہوئی۔ شبلی لکھتے ہیں کہ:

"نظم کا سب سے بڑا کمال یہی ہے کہ اگر اس کو منتشر کرنا چاہیں تو نہ ہو سکے۔"

میر انیسؔ کے کلام میں یہ خوبی بھی اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ موجود ہے۔ مثال کے طور پر یہ بند ملاحظہ ہو جس میں صغریٰ حضرت حسینؑ سے ہم کلام ہیں۔

قربان گئی اب تو بہت کم ہے نقاہت
تپ کی بھی ہے شدت میں کئی روز سے خفت
بستر سے میں خود اُٹھ کے ٹہلتی بھی ہوں حضرت
پانی کی بھی خواہش ہے غذا سے بھی ہے رغبت
حضرت کی دعا سے مجھے صحت کا یقین ہے
اب تو میرے منہ کا مزہ تلخ نہیں ہے

صغریٰ نے کہا آپ کی باتوں کے میں قربان
تم جان بچا لو کہ میں لونڈی ہوں پھوپھی جان
بیٹی ہو علیؑ کی میری مشکل کرو آسان
جیتی رہی صغریٰ تو نہ بھولے گی یہ احسان

میر انیسؔ نے محاوروں کے استعمال میں بھی فنکارانہ چابکدستی سے کام لیا ہے۔

حشر تک خلق میں ذکر غم انگیز رہا	ذکر رہنا
تو تو بچپن سے غلاموں سے بھی کچھ تیز رہا	تیز رہنا
صدقے کیئے فرزند پھوپھی سوگ نشیں ہے	صدقہ کرنا

سمجھے تو مرا حق ہے نہ سمجھیں تو نہیں ہے — حق ہونا
زندہ نہ محمد ہے نہ اب عون ہے بیٹا
تم بھی جو نہ پوچھو تو کون ہے بیٹا — نہ پوچھنا
خادم جدا نہ تھا تہہ گردوں سریر سے
کس جرم پر حضور خفا ہیں حقیر سے — خفا ہونا

میر انیس کی فنکارانہ پختگی کی دلالت کے لئے ایک شعر ہی کافی ہے ۔

طاقت اگر دکھاؤں رسالت مآب کی
رکھ دوں زمیں پہ چیر کے ڈھال آفتاب کی

میر انیس کی تشبیہات سے متاثر ہو کر شبلی رقم طراز ہیں :-

''تشبیہ کی خوبیاں جس قدر میر انیس کے کلام میں پائی جاتی ہیں اردو زبان میں ان کی نظیر نہیں مل سکتی۔''

چند اشعار مزید پیش خدمت ہیں جن سے میر انیس کی قوت بیانی کا علم ہو جاتا ہے۔ جب تمام اہل بیت ایک ہی رسی میں باندھ دیئے گئے تو اس حالت کا ذکر اس طرح کیا ہے ۔

گردنیں بارہ اسیروں کی ہیں اور ایک رسن
جس طرح رشتہ گلدستہ میں گلہائے چمن

حضرت عباسؓ پر جب ہر طرف سے برچھیاں چلنے لگیں تو اس منظر کا شاعرانہ بیان ملاحظہ ہو ۔

یوں برچھیاں تھیں چاروں طرف اس جناب کے
جیسے کرن نکلتی ہے گرد آفتاب کے

مذکورہ تمام وضاحتوں سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ میر انیس ایک صاحب طرز مرثیہ نگار تھے۔ انہوں نے اس صنف کو ایک خاص شہرت سے ہم کنار کیا۔

□□

حکیم لطیف احمد اور بشیر الدّین احمد دہلوی کے تعلقات خطوط کی روشنی میں

حکیم لطیف احمد کا شمار اُردو کے معروف تاریخ گو شعرا میں ہوتا ہے۔ آپ کا آبائی گھر صوبہ بہار کے موضع تھتھلی میں ہے جو اب سیوان ضلع میں واقع ہے۔ آپ کے متعدد تاریخی قطعات 'تہذیبِ نسواں'، لاہور میں (۱۹۰۸ء تا ۱۹۲۲ء) شائع ہو چکے ہیں۔ اِس کے علاوہ ہزاروں متفرق تاریخی قطعات ہیں جو مختلف فرمائشوں کی تعمیل میں وجود میں آئے۔

بشیر الدین احمد دہلوی، ڈپٹی نذیر احمد کے اکلوتے صاحبزادے تھے جو اپنے والد کی طرح ذی علم تھے۔ اُن کی تصانیف میں 'حکایاتِ لطیفہ' (تین حصّوں میں)، 'حکایاتِ عجیبہ' (تین حصّوں میں)، 'حسنِ معاشرت'، 'اقبال دلہن'، 'اصلاحی معیشت'، 'تاریخ بیجانگر'، 'تاریخ بیجا پور' (دو جلدوں میں)، 'حرز طفلاں'، 'نشاط عمر'، 'اعصائے پیری'، 'بچوں سے دو باتیں'، 'فرامین سلاطین'، 'انشائے بشر' اور 'لختِ جگر' (دو حصّوں میں)، وغیرہ وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں سے بیشتر کتابوں پر حکیم لطیف احمد کے کہے ہوئے تاریخی قطعات درج ہیں۔ بشیر الدّین احمد اپنے کلام پر حکیم لطیف احمد سے اصلاح بھی لیتے تھے جس کا مفصّل ذکر آگے آئے گا۔ اِس مضمون میں راقم الحروف نے حکیم لطیف احمد اور بشیرادین احمد دہلوی

کے تعلقات کو اُن کے خطوط کی روشنی میں منظر عام پر لانے کی کوشش کی ہے۔ جب ہم دونوں حضرات کے خطوط کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مذکورہ دونوں حضرات کے تعلقات کافی گہرے تھے۔ جو تا دمِ حیات برقرار رہے۔ کچھ خطوط ایسے بھی ملتے ہیں جن سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ بشیر الدّین احمد ضعفِ قویٰ سے مجبور ہو جانے کی وجہ سے دوسروں سے حکیم لطیف احمد کو خط لکھواتے تھے۔ مقدم الذکر کے خلوص اور محبت کا حال یہ تھا کہ حکیم صاحب کی جدائی ہفتہ سے زیادہ برداشت نہیں کر پاتے تھے۔ خط کے ذریعہ یاد کر لیا کرتے تھے۔ حکیم لطیف احمد کا ایک خط پیش خدمت ہے۔

۲۴۔۱۲۔۱۰

از تبھلی ڈاک خانہ بڑہریا، ضلع سارن

مخدومی تسلیم۔ ولادت نواسی مبارک۔

۲۲/ کا کارڈ یکم کو ملا اور ۲۹/ نومبر کا کارڈ ۳/ دسمبر کو، ۳ دسمبر کا کارڈ ۸/ دسمبر کو ملا...... فقط لطیف احمد

حکیم صاحب اور بشیر الدین کے تعلقات کا آغاز کس طرح ہوا اِس کی تفصیل کہیں نہیں ملتی۔ آخر الذکر کے چھوٹے صاجزادے جناب مسلم احمد نظامی نے میرے والد صاحب کو جو خط تحریر کیا تھا اس کو پڑھنے سے بھی پتہ نہیں چلتا کہ دونوں حضرات کے درمیان کب اور کیسے تعلقات استوار ہوئے، خط کے اصل الفاظ ملاحظہ ہوں۔

> ''آپ کے نانا مرحوم و مغفور سے مرے والد مرحوم کے تعلقات بڑے گہرے معلوم ہوتے ہیں کیسے ہوئے؟ آپ کے والد کو ضرور معلوم ہوگا۔ میرے والد کا انتقال ۱۹۲۷ء میں ہوا۔''

بقول مرے جدِ امجد مولوی سبحان احمد قدس اللہ سرہ کہ کسی شعر پر ناقدانہ اظہار خیال کی وجہ سے ان دونوں بزرگوں کے درمیان تعلقات کی ابتدا ہوئی۔ اس سے قطع نظر راقم الحروف کا خیال ہے کہ ان دونوں بزرگوں کے درمیان تعلقات استوار کرنے کا سہرا اخبار تہذیب نسواں، لاہور کے سر ہے۔ بشیر الدین احمد اور اُن کی اہلیہ چھوٹی دلہن دونوں اس اخبار کے مستقل مضمون نگار تھے۔ اِسی اخبار میں 'محفل تہذیب' کے نام سے ایک گوشہ تھا۔ جس میں قارئین اخبار اپنے رشتہ داروں کی پیدائش اور موت کی خبریں شائع کرواتے

تھے اور قطعات تاریخ پیدائش و انتقال کہنے کی فرمائش بھی کرتے تھے۔ اُن فرمائشوں کی تکمیل میں جناب لطیف احمد پیش پیش رہتے تھے۔ بشیر الدین احمد کے یہاں کی پیدائش اور شادی وغیرہ کی خبریں بھی اخبار مذکور میں شائع ہوتی تھیں جس پر حکیم صاحب نے تاریخی قطعات کہے اور یہیں سے دونوں حضرات کے تعلقات استوار ہوئے۔ تہذیب نسواں، لاہور کے ایڈیٹر نے نومبر ۱۹۱۰ء کے شمارے میں یہ خبر شائع کی ملاحظہ ہو :-

''ہمیں اس امر کے معلوم ہونے سے نہایت خوشی ہوئی کہ ہمارے اخبار کی معزز نامہ نگار چھوٹی دلہن صاحبہ بیگم بشیر الدین احمد تعلقدار گینگ گور حیدر آباد دکن کے یہاں ۲۲؍ اکتوبر کی صبح فرزند ارجمند پیدا ہوا۔ خدا تعالیٰ اُن کے خاندان کو یہ خوشی مبارک کرے۔ اور بچے کو عمر طبعی کو پہنچائے اور والدین کے زیرِ سایہ پروان چڑھائے۔''

اس ولادت کی خبر پڑھ کر جناب حکیم صاحب نے ایک قطعہ تاریخ ولادت مذکورہ اخبار کو بھیجا۔ جو ۲۱؍ جنوری ۱۹۱۱ء کو تہذیب نسواں میں شائع ہوا۔ ملاحظہ ہو۔

باغ میں حضرت بشیر الدین کے پھر
گل کھلا بار ششم اُمید کا

یعنی اب پیدا منیر الدین ہوا
دل کو پھر موقع ملا تحمید کا

دیکھ لیتے ہم بھی کاش اس کی شبیہ
تا نکل جاتا کچھ ارماں دید کا

مصرع تاریخ لکھ دوا ے لطیف
تیسرا ہفتہ ہے پہلی عید کا

۱۳۲۸ ہجری

اِس قطعہ کے علاوہ حکیم صاحب کے کئی قطعات تہذیب نسواں میں شائع ہو چکے ہیں۔ مثلاً بشیر الدین احمد صاحب کی اہلیہ چھوٹی دلہن کے انتقال پر قطعہ تاریخ وفات کہی جو ۲۱ را کتوبر ۱۹۱۲ء کے تہذیب نسواں میں شائع ہوا۔

خطوط کے مطالعہ سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ دونوں حضرات کے تعلقات میں ایک خاص قسم کی شدّت تھی جس کا تعلق روح کی گہرائیوں سے تھا۔ بشیر صاحب کے یہاں بیٹے کی ولادت ہوئی جس کی اطلاع موصوف نے خط کے ذریعہ حکیم صاحب کو دی۔ آخر الذکر اس خط کو پڑھ کر کس قدر خوش ہوئے اس کا اندازہ اُن کے ایک جوابی کارڈ سے لگایا جا سکتا ہے۔ ملاحظہ ہو :-

''فوراً ہم نے اُس کارڈ کو لے جا کر سیّدہ کو دِکھلایا، بہت خوش ہوئیں۔
بچے اور زچّے کے حق میں دعا کرنے لگیں۔''

دونوں بزرگوں کے درمیان تعلقات کی گہرائی کا اندازہ اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ بشیر الدین احمد نے حکیم صاحب کو جو خطوط لکھے اس میں اپنی گھریلو پریشانیوں کا بھی مفصّل ذکر کیا ہے۔ انسانی زندگی میں یہ مقام اس وقت آتا ہے جب قربت حد درجہ ہو۔ ملاحظہ ہو:-

''بعد سلام۔ آپ کا کارڈ مورخہ اکتیس دسمبر کا پہونچا، حال معلوم ہوا۔ بشریٰ اور بچی دونوں خدا کے فضل سے تندرست ہیں اور خیریت سے ہیں۔ عالیہ کا حال بدستور ہے۔ پیپ برابر نکل رہی ہے۔ مشہود خدا کے فضل سے اچھا ہے۔ خوب تماشہ کرتا ہے۔ چلنا بھی سیکھ لیا ہے ......شاہد احمد نے پڑھائی چھوڑ دی کیونکہ ان کو ڈاکٹری کی پڑھائی مشکل معلوم ہوتی تھی اور وہ پورا نہ کر سکے۔ اس لئے لاہور سے پڑھائی چھوڑ کر آگئے، روپے کا بھی نقصان ہوا۔''

بشیر الدین احمد کے دل میں حکیم لطیف احمد صاحب کے لئے ایک خاص جگہ تھی۔ مقدم الذکر کی طبیعت ناساز ہے۔ طرح طرح کے امراض میں مبتلا ہیں۔ اس کے باوجود ان کا دل ہے کہ حکیم صاحب کی خیریت جاننے کے لئے بے چین رہتا تھا۔ یہ خط دیکھئے اور اندازہ کیجئے :-

''دہلی کہاری باؤلی ۔ ۱۰ ر مارچ ۲۷ء

مکرمی بندہ حکیم صاحب دام

بعد سلام کہ معلوم ہو کہ بہت روز سے آپ کی خیریت نہیں معلوم ہوئی ۔ طبیعت پریشان ہے بواپسی ڈاک اپنی خیریت سے مطلع فرمائیں ۔ میری حالت بہت خراب ہے ۔ ہاتھ پاؤں دونوں بالکل بے کار ہیں ۔ پیشاب پاخانہ کی سخت تکلیف ہے ۔ چل پھر نہیں سکتا ۔ ہوش وحواس برابر نہیں ہے...... ''

حکیم لطیف احمد اور بشیر الدین احمد صاحب کے تعلقات کتنے گہرے تھے اس کا اندزہ اس بات سے بھی بخوبی ہو جاتا ہے کہ اوّل الذکر نے نہ صرف موخر الذکر کی اولاد کی تاریخیں کہیں بلکہ ان کی نواسی اور پوتے کی تاریخیں بھی لکھیں ۔ ملاحظہ ہو :-

قطعہ تاریخ ولادت نواسی

دل مارے خوشی کے پھول گیا غم دل میں جو تھا بھول گیا
بشریٰ کو خدا نے کی جو عطا یہ صبیہ خوش و ماہ لقا
تاریخ مسیحی واقعی اب ہے تم سے اس کی جو طلب
تو فکر ہے کیا ابھی کہہ دو، دختر بشریٰ بیگم سلمہا

۱۹۲۴ ہجری

قطعہ تاریخ ولادت پوتا

تیرہ تھی ماہ دسمبر کی، خنداں تھی صبح سنیچر کی!
کہ ہوا پیدا پہلا بیٹا مشہود احمد ہے نام اس کا
ماشاء اللہ آنکھیں اچھیں ناک اچھی پیشانی اچھی
ہیں ہاتھ اچھے ہیں پاؤں اچھے یعنی اچھا سرتا پا ہے
یہ بشیر احمد کا پوتا ہے ، یہ نذیر احمد کا پروتا ہے
یا یوں کہئے منذر کے بھائی کا ہے اکلوتا پوتا
ہو خضر کی عمر نصیب اسے، ہر آفت سے محفوظ رہے

پائے بخت اسکندر جیسا پھر اس پر ہے یہ خدا سے دعا
عزت بخشے، دولت بخشے علم اور ہنر وافر بخشے
پھر دادا جیسا ہوش و خرد پردادا جیسا فہم و ذکا
دانش اچھی بینش اچھی تمیز اچھی تہذیب اچھی
عادت اچھی خصلت اچھی اخلاص اچھا اخلاق اچھا
تاریخ لطیف تولد کی مولود سے مل جاتی ہے کبھی
اس امر کا شاہد ہے، شاہد احمد کا یہ خوشرو بیٹا

۱۹۲۴ء

ان قطعات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حکیم احمد اور بشیر الدین احمد کے درمیان کتنے گہرے روابط تھے اور اوّل الذکر موخر الذکر کے یہاں ہر تقریب میں کس طرح پیش پیش رہتے تھے اور اپنے دل کی اُمنگ اور خوشی کا اظہار تاریخی و دعائیہ قطعات کے ذریعہ کرتے رہتے تھے۔

حکیم لطیف احمد کے ایک خط سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اُنہوں نے انشائے بشیر کی تصنیف کے لئے قطعہء تاریخ لکھ کر روانہ کیا لیکن اس کے کچھ ہی دن بعد پھر ایک ترمیم شدہ قطعہء تاریخ لکھ کر بھیجا۔ اس واقعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ حکیم صاحب کا ذہن بشیر الدین کی تصنیف کے لئے ہمیشہ خوبصورت تاریخ کہنے کا متلاشی رہتا تھا۔ خط کے الفاظ ملاحظہ ہوں :-

''مخدومی تسلیم

آج ہمارا کارڈ مورخہ ۲۶ رنومبر جس میں قطعہء تاریخ انشائے بشیر ہے کس وقت ملا ہوگا۔ اس کے جانے کے بعد کچھ اس حق تقدیم و تاخیر اشعار کی نوبت آئی۔ اس لئے پھر دوبارہ روانہ کیا جاتا ہے۔ خدا کرے وقت پر پہنچ جائے اور اس کو موقع درج ہونے کا مل جائے۔''

حکیم لطیف احمد کی نظر باریک بین تھی۔ یہی وجہ ہے کہ عبارت میں خواہ جس قسم کی غلطی ہو ان کی نظر اس کی گرفت کر لیتی تھی۔ بشیر الدین صاحب کے ایک خط میں حکیم صاحب نے کچھ متروکات پایا جس کی نشاندہی کرتے ہوئے موصوف اپنے خط میں لکھتے ہیں :-

''تسلیم عرض ہے۔ پوتا مبارک باد۔ ۲۴ر دسمبر کا کارڈ ۱۹ر کو ملا۔ پوتے کی ولادت کی خوشی و مسرت ہوئی۔ خدا اس کی عمر دراز کرے۔ آپ کے کارڈ کی تحریر سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مارے خوشی کے قلم اختیار میں نہیں تھا۔ آپ کے خطوط میں ہم نے کبھی متروکات کی خطا نہیں پائی تھی۔ مگر اس کارڈ میں دو چار جگہ حرف چھوٹ گئے تھے اور بہت صاف طور سے عبارت کہتی تھی کہ بہت جلدی میں اور کثرت بھیڑ بھاڑ میں یہ کارڈ لکھا گیا ہے۔''

حکیم احمد کا ذہن تیز اور نظر باریک بین تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اکثر بشیر الدین احمد کی منظومات کی غلطیوں کی نشاندہی کر دیتے تھے۔ اس سے یہ ہرگز نہیں سمجھنا چاہئے کی حکیم صاحب فطرتاً نکتہ چیں تھے۔ بلکہ وہ اس لئے غلطی کی نشاندہی کرتے تھے کہ کبھی غلطی کرنے والا اور کبھی غلطی کی نشاندہی کرنے والا اپنی علمیت کا اندازہ لگا سکے۔ حکیم صاحب نے اپنے خط میں خود اس کی توجیہ اس طرح کی ہے۔ ملاحظہ ہو :-

''آپ کی نظم میں جو ہم غلطی نکالتے ہیں اور نکالنا چاہتے ہیں۔ بہ خدا نکتہ چینی کے طور سے نہیں اور نکتہ چینی کی عادت بھی ہماری نہیں۔ مگر ہاں اس خیال سے کہ آپ کی توجہ اس طرف بھی رہے...... ایسا کرنے میں کبھی تو آپ اپنی غلطی سے واقف ہو جائیں گے اور کبھی ہم ......''

شاہد احمد دہلوی (ایڈیٹر ساقی) کی تصنیف ''چند ادبی شخصیتیں'' کے صفحہ ۹۵ پر یہ رقم ہے کہ بشیر الدین احمد بیخود دہلوی، نواب سائل دہلوی اور نوح ناروی سے اصلاح لیتے تھے۔ ممکن ہے شاہد احمد دہلوی کو اس کی خبر نہ ہو کہ بشیر الدین احمد اپنے کلام پر حکیم لطیف احمد سے بھی اصلاح لیتے تھے۔ حکیم صاحب کا خط ملاحظہ ہو :-

''طبیعت بد خط نہیں ہوتی تو تمام دیوان ختم ہو گیا ہوتا۔ انشاءاللہ دو تین ہفتے میں کام ختم ہو جائے گا۔ بعد اس کے مثنوی ''دو دل'' کا بقیہ کام کی طرف توجہ کی جائے گی۔''

حکیم صاحب کی نظر کس قدر تیز تھی اس کا اندازہ اس واقعہ سے بھی ہو جاتا ہے کہ بشیر الدین صاحب نے اپنا ایک دیوان بغرض اصلاح نوحؔ ناروی کے پاس بھیجا۔ موصوف نے تصحیح کر کے لوٹا دیا۔ لیکن بشیر صاحب کو اطمینان نہ ہوا انہوں نے اس دیوان کو حکیم صاحب کے پاس بھیج دیا۔ چونکہ حکیم صاحب کو بشیر صاحب سے ایک خاص لگاؤ تھا لہٰذا اوّل الذکر نے پورے دیوان کو بڑی توجہ سے دیکھا اور اپنی جانب سے دیوان کو عیوب سے پاک کرنے کی حتی المقدور کوشش کی۔ سینکڑوں اشعار پر اصلاح دی اور اس کی توجیہ بھی تحریر کی حکیم صاحب کا خط ملاحظہ ہو :-

''ہم کو جو کچھ حیرت ہے وہ بالکل حضرت نوحؔ (نادری) پر کہ تقریظ میں لکھتے ہیں کہ اس دیوان پر گہری نظر ڈال کر اصلاح کی ہے۔ ہاں انسانی خطا سے محفوظ رہنا کسی کے لئے ممکن نہیں مگر ایک حد ضرور ہے۔ صفحہ ۷۱ اشعار ۱۰۔۱۲ کو غور سے دیکھئے گا۔ قافیے میں (زبان بریدہ ہوں، پشت خمیدہ ہوں) ان دونوں جگہ 'زبان' اور 'پشت' پر زبردستی ضافت لگائی ہے جس سے شعر بے معنی ہو گیا ہے۔ یہ غلطی عروض اور شاعری کی نہیں ہے بلکہ یہ نحوی غلطی ہے اس کو گہری نظر سے نہیں دیکھا۔''

حکیم صاحب کے اصلاح شدہ دیوان کے مندرجہ ذیل اشعار سے موصوف کی قادر الکلامی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

نمبر صفحہ	نمبر شعر بہ تخصیص صفحہ	مصرع ترمیم طلب	مصرع ترمیم شدہ	توجیہ
۵۶	۲	اس دل وارفتہ کہنا مان باز ارادے سے	دل وارفتہ باز آ مان کہنا اس آس ارادے سے	اس کی توجیہ ظاہر ہے

۷۵	۲	مرادیں دل کی بر آئیں نکالوں حوصلے دل کے	مرادیں دل کی بر آئیں نہ نکلے حوصلے دل کے	
۱۳۵	۱۸	رحیم کوئی نہیں جاں آفریں کی طرح	رحیم کوئی نہیں روح آفریں کی طرح	فارسی ترکیب میں جان یا علان اردو ہے اور جان آفریں ترکیب فارسی ہے۔
۱۱۷	۱۲	ابھی تک تو بشر کہتا تھا میں ان کو سمجھتا تھا	ابھی تک تو بشر ان کو میں کہتا تھا سمجھتا تھا	پہلے مصرع میں تعقید تھی اور دوسرے مصرع
		جو دیکھا حور نکلے حور کے وہ ہو بہو نکلے	جو دیکھا غور سے تو حور کے وہ ہو بہو نکلے	میں یہ سقم ہے جب حور ہے تو پھر ہو بہو حور کے مناسب نہیں

حکیم صاحب کا یہ اصلاح شدہ دیوان بشیر احمد دہلوی کے پاس پہونچا تو اُنہوں نے اپنے ایک خط میں شکریہ ادا کیا۔ ملاحظہ ہو :-

''میں بہت شکر گذار ہوں کہ آپ نے کافی غور سے دیوان کو دیکھا بلکہ زیادہ غور سے دیکھا۔ نوح ناروی نے سرسری نظر ڈالی، اتنی جگر کاوی کون کرتا۔''

اسے اظہارِ تشکر ہی کہئے کہ بشیر الدین احمد دہلوی نے اپنے دوسرے خط میں بھی اصلاح شدہ دیوان کے پہونچنے کی خبر دی۔ موصوف کے لفظوں میں ''آپ کا خط مع پرچاجات اصلاحی دیوان پہونچا، میں نے محفوظ کرلیا ہے۔'' بشیر صاحب کو حکیم صاحب کے کہے ہوئے قطعات پسند تھے اوّل الذکر کے خطوط سے یہ بھی بات سامنے آتی ہے کہ موصوف اپنی کتابوں کے لئے تاریخی قطعات کی فرمائشیں بھی کرتے تھے۔ ملاحظہ ہو:-

''حکایات لطیفہ اور لطائف عجیبیہ دونوں کے لئے دو قطعے علیٰحدہ لکھ دیجئے۔ مضمون یہ ہو کہ پس مردہ خاطر اور ملول دل تفکر و تردد کے وقت لطیفے اور حکایات سے دل شگفتہ اور غم کو غلط کرتے ہیں۔''

بشیر الدین صاحب حکیم لطیف احمد کو کس قدر عزیز رکھتے تھے اس کا اندازہ اوّل

الذکر کے ایک خط سے لگایا جاسکتا ہے جس میں انہوں نے اپنی ناگفتہ بہ حالت کے باوجود حکیم صاحب کو خط لکھتے رہنے کی گذارش کی ہے۔ ملاحظہ ہو :-

"......لیکن فائدہ کسی قسم کا نہیں ہے بظاہر آرام ہونے کی صورت نظر نہیں آتی ۔ بہر حال جب تک زندہ ہوں خط لکھتے جایئے آپ دعا کیجئے ۔ کیونکہ میرا آخیر وقت ہے۔"

آخر کار وہ وقت آ ہی گیا جب حکیم صاحب کو اپنے دیرینہ دوست کا قطعہ تاریخ وفات بھی لکھنا پڑا۔ ملاحظہ ہو :-

کر کے طے منزل فنا کی راہ
جب ہوئے داخل بہشت بشیر
فکر سال وصال کیا ہے لطیف
لکھ دو واصل بہشت بشیر

١٣٤٦ ہجری

□□

اُردو کا پہلا نفسیاتی ناول نگار

مرزا ہادی رسوا اُردو ناول نگاری کی تاریخ میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ کیونکہ اُنہوں نے قصّے کی اس جدید صنف کو فکر و فن کے نقطہ عروج سے آشنا کیا ۔ اُن کے ناول 'امراؤ جان ادا' کو غیر معمولی مقبولیت اور اہمیت اس لئے حاصل ہوئی کہ مرزا ہادی رسوا نے اس ناول کے ذریعہ متعلقہ عہد کی معاشرتی اور تہذیبی زندگی کی بہترین مصوّری کردی ہے ۔ 'امراؤ جان ادا کے علاوہ میں ان کے ایک ایسے ناول کا مطالعہ پیش کر رہا ہوں جس کی طرف اب تک کوئی خاص توجہ نہیں دی گئی ہے ۔ حالانکہ نفسیاتی اعتبار سے اس کی افادیت اور تاریخی لحاظ سے اس کی اہمیت لائق توجہ ہے ۔ رسوا کا نایاب ناول 'خونی عاشق' ہے ۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر آدم شیخ اپنے تحقیقی مقالے میں رقم طراز ہیں :-

> ''خونی جورو، خونی بھید، خونی شہزادہ اور بہرام کی رہائی کے علاوہ خونی عاشق اور خونی مصوّر بھی مرزا رسوا کے جاسوسی ناول ہیں ، لیکن بمبئی ، لکھنو و دیگر مقامات میں تلاش بسیار کے بعد بھی رقم الحروف کو موخر الذکر دونوں ناول دستیاب نہیں ہو سکے ۔ مظہر لائبریری میں خونی عاشق کا اندراج ملتا ہے لیکن ناول نایاب ہے ۔''
>
> (مرزا رسوا حیات اور کارنامے ، صفحہ ۲۰۳)

ڈاکٹر میمونہ بیگم انصاری مارہروی نے اپنے مقالے میں درج ذیل نشاندہی کی

ہے :-

''خونی عاشق میری کوری کے ناول کا ترجمہ ہے۔''

(مرزا محمد ہادی رسوا سوانح حیات اور ادبی کارنامے، صفحہ ۴۴)

راقم الحروف نے 'خونی عاشق' کی تلاش خدا بخش لائبریری، پٹنہ، سنہا لائبریری، پٹنہ، مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ اور دیگر کتب خانوں میں کی مگر کامیابی حاصل نہ ہوسکی لیکن اتفاق سے مذکورہ ناول کی ایک جلد ایک بزرگ کے یہاں دستیاب ہوئی۔

'خونی عاشق' کو کسی نے جاسوسی ناول قرار دیا تو کسی نے انگریزی ناول کا ترجمہ قرار دیا۔ دراصل 'خونی عاشق' ایک انگریزی ڈرامے Worm wood کا چربہ ہے۔ جسے مرزا رسوا نے ایک مستقل ناول کا روپ دیا۔ نول کشور پریس، لکھنو نے ۱۹۲۵ء میں اسے شائع کیا۔ ورم وڈ پیریس کے متعلق ہے اور تین جلدوں پر مشتمل ہے۔ یہ ڈرامہ ۱۸۹۰ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کی مصنفہ کا نام Corelli Marie ہے، جس کی ولادت ۱۸۵۵ء میں لندن میں ہوئی تھی۔ پہلے اسے موسیقار بننے کا شوق ہوا بعد میں اس کا شوق ادب پر مرکوز ہوگیا۔ موخر الذکر شوق کی وجہ سے مصنفہ کو انیسویں صدی کے آخر میں کافی شہرت حاصل ہوئی۔ اس کا پہلا ناول A Romance of two worlds ہے۔ یہ ۱۸۸۶ء میں شائع ہوا اور یہ دو جلدوں میں ہے۔ اس کا انتقال ۱۹۲۴ء میں ہوا تھا۔ 'خونی عاشق' کا پلاٹ مختصراً یہ ہے :-

''کونٹ دی شارلز نے اپنی صاحبزادی پالائین کے گھر لوٹنے کی خوشی میں ایک پارٹی کا انتظام کیا۔ چند خاص لوگوں میں دعوت نامہ تقسیم کیا گیا۔ جس میں چالس بودلیس بھی شامل تھے۔ جن کی دولت آسمان پر بکھرے تاروں کی مانند تھی۔ چارلس بودلیس نے اپنے صاحبزادے گیستن بودلیس کے ساتھ پارٹی میں شرکت کی۔ گیستن بودلیس اپنے باپ کا اکلوتا بیٹا ہے۔ حسن وکشش کا مالک اور اپنے والد کی کثیر دولت کا اکلوتا وارث جس کی وجہ سے کنواریوں اور لڑکیوں کی نظروں میں کچھ زیادہ ہی حسین اور خوب صورت ہوگیا تھا۔ پالائین کی فطرت عام لڑکیوں سے مختلف ضرور تھی مگر اسے کیا کہئے کہ عشق کے دیوتا، کیوپڈ، جب مچل جائیں تو بڑے بڑے پارساؤں کا ایمان متزلزل ہونے لگتا ہے۔ پھر دنیاوی

ملامت اور خوفِ خدا ایک طرف اور عشق ایک طرف۔ پالائین غریب کی بساط ہی کیا تھی۔ تقریب اپنے شباب پر تھی کہ پالائین اور گیستن بودلیس کی نظریں ملیں اور وہ ایک دوسرے کے دل میں سما گئے۔ روٹھنے منانے کا سلسلہ چل پڑا۔ قسمیں کھائی جانے لگیں اور زندگی بھر ساتھ نبھانے کے وعدے کئے جانے لگے۔ ایک جان دو قالب والا مقولہ صادق آ گیا۔ حد سے بڑھی قربت کے نتیجے میں دونوں کی شادی کی بات پکی ہو گئی۔

پادری وارڈن کلیسا کے خادم تھے۔ کچھ دنوں سے صبح کی عبادت میں ان کی مدد ایک رشتہ دار کر رہا تھا جس کا نام سلوین گڈیل تھا جو نہایت خوب صورت اور شگفتہ شخصیت کا مالک تھا۔

ایک دن گیستن بودلیس پالائین کے گھر گیا۔ اسے جان کر حیرت ہوئی کہ پالائین چرچ گئی ہوئی ہے۔ کچھ دنوں کے بعد یہ راز کھلا کہ پالائین سلوین گڈیل کے عشق میں بری طرح مبتلا ہے۔ عبادت حقیقی کی آڑ میں عبادت مجازی کیا کرتی ہے اور جسمانی لذتوں سے آشنا ہوتی رہتی ہے۔ گیستن بودلیس رقابت کی آگ میں جلنے لگا اور اس نے عین شادی کے دن اپنی ہونے والی بیوی پر بدکاری کا الزام لگا کر شادی کرنے سے انکار کر دیا۔ پھر اس انکار نے کئی قیامتیں ڈھائیں۔

پالائین کے باپ اپنی بیٹی کی سرِ عام تذلیل برداشت نہ کر سکے اور سفرِ آخرت پر روانہ ہو گئے۔ پالائین اپنے اوپر لگنے والے کلنک سے دل برداشتہ ہو کر گھر سے فرار ہو گئی۔ چارلس بودلیس نے اپنے صاحبزادے کے 'انکار' کو ناپسندیدہ نظروں سے دیکھا اور اسے گھر سے نکال دیا۔

گیستن بودلیس اب آواروں کی طرح اِدھر اُدھر گھومنے لگا جس کے نتیجے میں بھی کئی واقعات رونما ہوئے۔ سلوین گڈیل اور گیستن بودلیس کی مڈبھیڑ اس مقام پر ہوئی جہاں پالائین روز صبح امانت میں خیانت کرتی تھی۔ جوشِ انتقام سے مغلوب ہو کر گیستن بودلیس نے سلوین گڈیل کو مار ڈالا اور اسے دریا کے سپرد کر دیا۔ اسی آوارگی کے دوران گیستن بودلیس کی ملاقات پالائین سے ہوئی، سلوین گڈیل کی موت کی خبر سنتے ہی پالائین دنیا سے ایسی بیزار ہوئی کہ دریا میں کود کر جان دے دی۔

اس آوارگی کے دوران گیستن بودلیس کی ملاقات مشہور مصوّر آنڈری گیو سے ہوئی۔ جس کی فلاسفی اور شراب پینے کی ترغیب نے گیستن بودلیس کو کافی متاثر کیا۔ جس کے نتیجے میں شراب اس کی زندگی کا ایک جزو بن گئی۔

آوارگی کے دوران گیستن بودلیس کو معلوم ہوا کہ ہیلا لوس کبھی اس سے خاموش محبت کرتی تھی۔ ایک دن نہ چاہتے ہوئے بھی گیستن بودلیس کے قدم ہیلا لوس کے گھر کی جانب اُٹھ گئے۔ دیکھتا کیا ہے کہ لوگ افسردہ اور خاموش کھڑے ہیں۔ کمرے کے اندر داخل ہوا ہی تھا کہ دھڑکنیں تیز ہوتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ ہیلا لوس کی لاش سامنے تھی...... روح فرسا نظارہ دیکھ کر اس کی تمام اُمیدوں پر پانی پھر گیا اور اس نے خودکشی کر کے باقی زندگی سے پنڈ چھڑا لیا۔

'خونی عاشق' کے مطالعہ کے بعد مذکورہ ناول کی نوعیت ''ورم وڈ'' کے محض چربے کی نہیں معلوم ہوتی بلکہ مرزا رسوآ نے اس کی تراش خراش اس انداز سے کی ہے کہ فلسفیانہ اور نفسیاتی اعتبار سے بھی اس کی مستقل ایک ادبی حیثیت ہو گئی ہے۔ حقیقتاً یہ اُردو کا پہلا ناول ہے جس میں جذبۂ عشق کی تعبیر و تشریح نفسیاتی طریقے سے کی گئی ہے۔ مرزا رسوآ کی ژرف نگاہی اور فنی دانشوری نے 'خونی عاشق' کی قدر و قیمت بڑھا دی ہے۔ جس کی ایک مثال یہ ہے کہ گیستن بودلیس اپنی تباہی کے بعد غصہ کی حالت میں سلوین گڈیل کو رقع دینے کے لئے پادری وارڈن کے گھر پہنچتا ہے۔ ملازمہ مارگیٹ دروازہ کھولتی ہے۔ گیستن بودلیس سلوین گڈیل کے بارے میں دریافت کرتا ہے جس کے جواب میں وہ کہتی ہے کہ وہ جا چکا ہے۔ گیستن بودلیس کے مزید استفسار پر ملازمہ مارگیٹ ناراض ہو کر دروازہ بند کر لیتی ہے۔ اس کے نتیجے میں گیستن بودلیس پر خود کلامی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے ملاحظہ ہو :-

> ''دیوانی بڑھیا! اس ہڈی چمڑے پر اب تک یہ عاشق مزاجی یہ حسن پرستی۔ لیجئے ان بڑی بی پر بھی سلوین گڈیل کے غارت گر منحوس حسن نے اثر کیا۔ ایسا اثر کہ جاتے وقت نہ ملے اور خدا حافظ نہ کہنے کا ملال ہے اور مجھ سے اس لئے بگڑ گئیں کہ میں ان کے حسن کا قدرداں نہیں ہوا۔ عورت کی ذات بھی کتنی بے وقوف ہے۔ ذرا

مسکرا دینے نظر ڈالنے پر پس گئیں۔ ڈیل ڈول چہرے مہرے پر دم دیتی ہے۔ حسن ظاہری پر فدا ہیں باطن سے کوئی غرض نہیں۔ اتنی علمی ترقی کے بعد بھی جب یہ حال ہے کہ الفت کے جال میں شاید جانوروں سے کچھ ہی ہوں تو کیا خاک تہذیب نے ترقی کی ہے۔ جسمانی جثہ کا کمال ذہنی کمال سے زیادہ ہمارے لئے دلکش۔ جیسے ایک شیر شیرنی کے موٹے تازے ہاتھ پاؤں مخمل کی سی جلد چمکتی ہوئی لال لال آنکھوں پر فریفتہ ہو کر اس کے گرد ہو جاتا ہے۔ بس وہی ہمارا بھی حال ہے۔ جہاں کوئی عورت اچھے ڈیل ڈول کی۔ بھرے بھرے بازو، چکنے چکنے گال، نکیلی ادا دیکھ لی۔ بس گرفتار ہو گئے۔ عورت ضعیف القویٰ جہاں مرد اپنے سے توانا دیکھا اور نگاہیں ڈالنے لگی۔ شاید کہیں کہیں اس کلیہ کے خلاف بھی ہوتا ہو، مگر ایسا شاذ و نادر ہے کہ انسانوں میں اس کا ذکر آتا ہے نہ تاریخی واقعات میں۔ ہم لوگ اس زمانے والے واقعیت اور حقیقت کو دوست رکھتے ہیں۔ راست اور بدنما حقیقت کو بناوٹ سے آراستہ نہیں کرتے۔ بہتر ایک واقعہ بہت سچا مگر وہ خیال ہے کہ محض حسن ظاہری بالکل عارضی اور چند روزہ ہے اور جب حسن ظاہری میں تغیر ہوتا ہے تو وہ اس قدر مکروہ ہو جاتا ہے کہ آنکھ سے دیکھنے کو جی نہیں چاہتا۔ اسی طرح جو محبت فقط حسن ظاہری کی وجہ سے ہوتی ہے وہ بھی چند روزہ ہے۔ تھوڑے ہی دنوں میں یہ الفت نفرت میں بدل جاتی ہے۔ جسمانی محبت کی ہم کو ایسی سزا ملتی ہے کہ یہی عالم ہمارے لئے دوزخ ہو جاتا ہے۔"

('خونی عاشق'، صفحہ ۱۲۶)

اس نفسیاتی ژرف نگاہی کی دوسری مثال ملاحظہ فرمائیں:۔

"گیستن بودلیس اور پالائین کی شادی طے پا چکی تھی۔ اسی دوران

پالائین کی نظر سلوین گڈیل سے جاٹکرائی۔ دونوں ایک دوسرے کو اپنی اپنی ذات میں جذب کرتے چلے گئے۔ ان کا عشق سبزہ خط سے شروع ہوکر ملائم شکم سے ہوتا ہوا اک شے مخملی تک جا پہنچا۔ گیستن بودیس کو کافی دنوں بعد یہ علم ہوا کہ پالائین وصل کی لذتوں سے آشنا ہوچکی ہے۔ وہ رقابت کی آگ میں جلنے لگا۔ شادی کے دن اپنی ہونے والی بیوی پر بدکاری کا الزام لگا کر شادی سے انکار کردیا۔

چارلس بودیس اپنے صاحبزادے گیستن بودیس کے اس انکار پر برہم ہوگئے اور وہ اسے کچھ دنوں کے لئے شہر پارلیس سے باہر جانے کا حکم دے دیا۔

لائق بیٹے نے باپ کے حکم کی تعمیل کی۔ اسباب باندھا اور گھر سے نکلتے وقت یہ تاثر دیا کہ وہ اطالیہ کو جارہا ہے لیکن بقول گیستن بودیس ''کہ میرا یہ قصد ہی نہیں تھا کہ میں پارلیس سے کہیں دور جاؤں۔'' چنانچہ پارلیس کے ہوٹل میں فرضی نام سے ایک کمرہ لے کر رہنے لگا۔ آوارہ گردی اس کی زندگی کا نصب العین بن گئی۔

ایک طرف گیستن بودیس کے دل میں اپنی بربادی کا بدلہ لینے کا جذبہ موجزن تھا تو دوسری طرف سلوین گڈیل پادری بن جانے کے باوجود پالائین کو نہ بھلا سکا اور پارلیس پہنچ گیا۔ ان دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو ملاحظہ ہو :-

''تم یہاں موجود ہو تم سلوین گڈیل۔

سلوین گڈیل کہتا ہے۔

''ہاں میں یہاں موجود ہوں۔ میں نے چاہا تھا کہ میں دور رہوں لیکن بالآخر دل نہ مانا۔ کیا وہ اچھی ہے؟ میں ایسا غصہ بھرا ہوا تھا کہ فوراً جواب نہ دے سکا، اور حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔ اس نے میری جانب سے نگاہیں نہیں پھیریں اور مکرر بے تابانہ یہی سوال کیا۔ مجھے بتاؤ وہ بخیر ہے؟ اگر مجھے حق نہیں ہے کہ میں اس کی

خیر و عافیت دریافت کروں۔ شاید تم اس کے شوہر ہو مگر میں اس کا عاشق ۔ خدا مجھے معاف کرے اور پھر میں یہی پوچھتا ہوں کہ وہ اچھی تو ہے۔ مجھے معلوم ہوگیا کہ اس کو کوئی اطلاع نہیں کہ کیا گذری۔ یہ خیال کر کے میرے غصہ کو افاقہ ہوا۔ میں نے مسکرا کر طنز کے ساتھ کہا کہ وہ مرگئی۔ اس نے حقارت سے منہ بنایا اور اب بھی مجھے گھور رہا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا تمہاری بات کا یقین نہیں ہے۔ اس کے مرنے کے دن نہیں ہیں۔ وہ بہت کم سن، خوب صورت ہے ممکن ہے مرجائے مگر میں جانتا ہوں کہ وہ زندہ ہے، میں نے جواب دیا تم کو معلوم ہے کہ وہ نہیں مری، تمہیں کیونکر معلوم ہوا۔ میں تم سے کہتا ہوں کہ وہ مرگئی اپنی محبت اور عزت کرنے والوں کے لئے مرگئی۔ کیونکہ کافی وقت تمہارے تلاش کرنے کا اس کو تھا اور چاہتی تو تم کو ڈھونڈ لیتی۔ اس کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ اُس کو فوری خوف سا ہوا اور متحیر ہوگیا۔ اُس نے جلدی سے کہا وہ مجھے تلاش کر لیتی۔ تمہارا کیا مقصد ہے کیا وہ تمہاری زوجہ نہیں ہے کیا تم نے اُس سے شادی نہیں کی۔ میں غصہ میں اپنی بوٹیاں نوچنے اور کاٹنے لگا۔ اِس طرح کہ واقعی میرے ناخن بدن میں درآئے۔ بے ہودہ! کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ میں تمہاری مردود آشنا سے شادی کرتا۔ وہ جھک کر میری طرف بڑھا اور میرے شانے دبائے، گویا شکنجہ میں کس لیا اور غصہ ہو کے کہا۔ اِس طرح کہ مارے غصہ کے اس کے منہ سے بات نہ نکلی تھی۔ گیستن بودیس ایسا نہ کہو۔ اُس کم سن بچہ کو کوئی الزام نہ دو جس کی بے گناہی اس کی بربادی کا باعث ہوئی۔ ہم تم یہاں آج کی رات آمنے سامنے کھڑے ہیں۔ خدا شاہد ہے کیا ہم تم حقیقت نہیں جانتے۔ ہم تم مرد ہیں اور اس حیثیت سے کم سن لڑکی کے جوشِ محبت کے جذبے سے ناجائز طریقے سے کامیاب ہوتے

ہیں۔اس کی معصیت عشق ہماری سیاہ کاریوں کے مقابلے میں بالکل نیکی ہے۔ میری پیاری کی مصیبتوں کا الزام صرف مجھ پر ہی عاید ہوتا ہے۔تم کہتے ہو کہ تم نے اس سے شادی نہیں کی ہے تو پھر وہ کہاں ہے۔ چونکہ میرا ہی قصور تھا اس لئے مجھی کو اس کا تدراک کرنا چاہئے۔ خدا ہی جانتا ہے کہ میں کیسا پشیماں ہوں لیکن تم اس پر فتویٰ دینے کا اعادہ نہ کرو۔تم بھی تو انسان ہو۔ ایک عورت کی تذلیل تم کو سزاوار نہیں ہے۔ اس نے مجھ کو آہستگی سے چھوڑ دیا۔ اس طرح کہ میں پیچھے کی طرف گرتے گرتے بچا۔ وہ اگلی مقناطیسی کشش جو اس کی آواز میں تھی اس نے میرے غصہ کو ایک لمحہ کے لئے فرد کر دیا۔ میں مبہوت سا ہو گیا اور اس کی صورت دیکھنے لگا۔ اس کی نورانی صورت چاندنی سے زیادہ منوّر ہو گئی تھی۔ اس کے غرورانہ امتیازی انداز سے پیدا تھا کہ اگر کوئی دیکھتا تو کہتا کہ اس پر ظلم ہوا ہے۔ وہ مظلوم ہے اور میں ظالم ہوں...... یہی وہ مقام ہے جہاں وعدے پورے ہوئے تھے۔ وہ اس طرح کہہ رہا تھا کہ جیسے کوئی خواب میں باتیں کرے۔ انہیں درختوں کے سائے میں محبوبہ کے ہاتھ میں ہاتھ اس کا سر میرے سینے سے لگا ہوا اور اس کی پیاری آنکھوں سے وہ بات نکلتی تھی جو وہ زبان سے نہ کہہ سکی تھی۔ ہم اس طرح ٹہلا کرتے تھے۔ یہیں ہم نے اس لذت کا ذائقہ لیا ہے جو خدائی عطیات میں سب سے زیادہ شریں ہے جو کہ زندگی دیتی ہے اور موت لیتی ہے۔

گیستن بودیس یہ لذت تمہاری قسمت میں نہ تھی کیونکہ میری پیاری نے تم کو کبھی نہیں چاہا...... وہ مجھ کو چاہتی تھی اور صرف مجھی کو۔ ہاں! اگر تم اس سے شادی بھی کر لیتے اور میرے قصور اس سے بھی دس ہزار درجہ زیادہ ہوتے تب بھی وہ مجھی کو وفاداری سے چاہتی۔ آخری

عمر تک میں نے درشتی سے کہا تم اس پر فخر کرتے ہو۔ تم کو فخر کی مجال ہے؟ اس نے کامیابی پر نازاں ہو کے تبسم کیا۔

ہاں ایسا ہی ہے مجھے اس پر ناز ہے اور یہ نازش کے قابل ہے کہ کسی شخص سے ایک بار کوئی سچی محبت کرے۔

میں نے زور سے اپنی مٹھی دبائی۔ میں نے نہایت اضطراب سے پوچھا کیا تم اس کو تلاش کرو گے؟

ہاں میں تلاش کروں گا۔

....

اور اگر وہ مل گئی تو کیا کرو گے؟

کیا کرو گے؟ پھر اس نے نہایت مغرورانہ اہانت کے انداز سے تاروں بھرے آسمان کی طرف نظر کی۔ پھر کیا کروں گا۔ اس کی خاطر سے ممکن ہے اپنی روح کو جہنم واصل کروں گا۔ ایسا ہی کرنا ہوگا۔ اگر کلیسا ایک خدائی حکم ہے مگر میں نے یہ خیال کرلیا ہے کہ اگر ایسا اتفاق پڑے تو خدا کی عظمت کلیسا سے بہت بڑی ہوتی ہے۔

بے شک وہ زیادہ مہربان اور رحیم ہے اور بڑا دانا اور بینا ہے۔ جس کا وہم وگمان بھی اس کے مخلوق انسان پر نہیں ہوسکتا۔ مجھے اس امر میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے اگر یہ سچ ہے کہ جب اس عورت کی جس کے ساتھ میں نے بدی کی ہے حمایت کروں گا اور اس کو تسلی دوں گا اور جس کے ساتھ بدی کی جائے صرف محبت سے اس کو تسلی ہوسکتی ہے۔ اس کے قدموں پر گر کر اپنی خطا کی معافی چاہوں گا تو امید ہے کہ خدا بھی مجھ سے راضی ہو جائے۔ میں نے کہا۔

لافزن، مکار، منافق! بدنام کنندہ نکونامے چند! اب وہ مجھ کو اور بھی ذلیل معلوم ہوا کہ اس بدی کے ساتھ اور دعویٰ دینداری اب تو بجلی کی طرح وہ میرا غصہ جو فرو ہوگیا تھا پھر تازہ ہوگیا اور بغیر اس کے

کہ اس کو آگاہ کروں میں اس پر جا پڑا جیسے کوئی وحشی درندہ کسی پر جا پڑتا ہے۔''

الغرض گیستن بوریس نے سلوین گڈیل کو ہمیشہ کے لئے سرد کر دیا۔ ایک مثال اور پیش خدمت ہے :

گیستن بودیس پر جوش انتقام غالب آجاتا ہے۔ وہ سلوین گڈیل کو مار ڈالتا ہے اور ہر طرح سے اطمینان بھی کر لیتا ہے۔ پھر اس کے بدن میں خوف کی ایک لہر دوڑ جاتی ہے۔ وہ اپنے اردگرد دیکھتا ہے کسی انسان کو نہ پا کر اطمینان کی سانس لیتا ہے۔ یک لخت اسے خیال آتا ہے کہ مقتول کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ یہ خیال آتے ہی وہ پھر ایک انجانے خوف میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ ملاحظہ ہو :

''میں نے خوف سے اپنے مقتول کو دیکھا اور زور سے چیخا۔ آنکھوں کو دبا کے میں نے بند کر دیا تھا۔ وہ خوب کھلی ہوئی تھیں اور مجھے گھور گھور کر دیکھ رہی تھیں۔ اور کیسے موقر سکوت کے ساتھ۔ پھر دیوانہ وار اس کی لاش کی طرف بڑھا اور اس کے پپوٹوں کو جو کہ اب سرد تھے اور متمروانہ کھل جاتے تھے، میں نے زور سے دبا دیا۔ لیکن فضول! وہ پھر بند کرتے ہی کرتے کھل گئے اور آنکھیں اسی بلوری انداز سے نمایاں ہو گئیں۔ میں نالہ کر رہا تھا اور کانپتا جاتا تھا، اور خوف کا پسینہ میری پیشانی سے ٹپک رہا تھا۔ میں نے علم طبیعات کے ماہرین سے سنا تھا کہ مقتول کی آنکھوں میں دم واپسیں قاتل کی تصویر بن جاتی ہے اور جب چاہیں قاتل کی تصویر ہو بہو مل سکتی ہے۔ کیا یہ ممکن ہے۔''

('خونی عاشق'، صفحہ ۱۹۷)

حسن و عشق کی ماہیت پر فلسفیانہ بصیرت ملاحظہ ہو :

انسان بھی کس قدر بیوقوف ہے : ایک خوشنما صورت کے لئے جو ایک زمانے میں بڑھاپے سے ضرور بدنما ہو جائے گا عمر بھر کے لئے

خط غلامی لکھ دیتا ہے۔ عشق کیا ہے۔ خون کی گرم جوشی، ایک بخار کی قسم جو مثل سیمیات (بخاروں) کے تدبیر سے سرد ہو سکتا ہے۔ بشرطیکہ مریض علاج کی کوشش کرے، اس میں ہزال کی بھی صفت ہے۔ آدمی دبلا ہوتا جاتا ہے۔ الفت عشق جسم و جاں دونوں کی لاغری کا باعث ہوتی ہے۔''

('خونی عاشق'، صفحہ ۱۲۳)

مندرجہ بالا اقتباس میں مرزا رسوا نے انسانی نفسیات کی مصوری بھی کی ہے اور فلسفیانہ غور و فکر کے مواقع بھی فراہم کیے ہیں۔

'خونی عاشق' کے مطالعہ سے فرانس کی تہذیب و تمدن، معاشرتی بدحالی، لوگوں کی بے راہ روی، ان کے فرسودہ عادات و اطوار کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

فرانسیسیوں کا مذاق سلیم کس حد تک گرا ہوا تھا اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک بے ہودہ کارٹون شائع ہوا جسے مصور آنڈری گیسو نے بھی خریدا۔ گیستن بودلیس کے الفاظ میں:

''میں نے دیکھا کہ انہوں نے وہ رسالہ جس میں تصویر تھی خرید کر کے ہاتھ میں لیا اور ایک بڑے زور کا قہقہہ لگایا۔ اس کارٹون کو دیکھ کر اور ان کے ساتھ اس مسماۃ نے بھی قہقہہ لگایا جو اخبار بیچ رہی تھی۔ جسے ادنیٰ درجے کی فرانسیسی عورتوں کا خاصہ ہے۔ ہر فحش اور بے ہودہ چیز کی قدردانی پر خوش ہوتی ہیں۔''

('خونی عاشق'، صفحہ ۶۲۶)

مردہ پرستی کا جو شعار فرانسیسی معاشرے میں موجود تھا اس کا ایک پہلو دیکھیں:

آنڈری گیسو کی تمام زندگی تنگی میں گذری۔ کبھی فاقہ تو کبھی آدھا پیٹ کھانا میسر ہوا۔ وہ جب تک زندہ رہا عوام الناس نے قابل توجہ نہیں سمجھا۔ ایسی زندگی سے تنگ آ کر اس نے خودکشی کر لی۔ یہ خبر پھیلتے ہی عوام جوق در جوق اسے دیکھنے آئے اور دیکھتے ہی دیکھتے آنڈری گیسو قوم کا ہیرو بن گیا۔ پولیس گیستن بودلیس سے استفسار کرتی ہے۔ وہیں

پر ایک شخص اور کھڑا تھا۔ ان تینوں کے درمیان ہونے والی گفتگو ملاحظہ ہو :

"مگر آپ نام بتا سکتے ہیں۔

بے شک۔ آندڑی گیسو!

ہائیں: وہ صناع: ایک شخص جو میرے پاس کھڑا تھا۔ اس نے چلا کر کہا :

خدایا کیا مصیبت ہے۔ انڈری گیسو۔ وہ استاد کامل۔ ہمارے ملک میں ایسے استادوں کی کمی نہیں۔ افسوس آنڈری گیسو ایسے مصوّر مر گئے۔ ہائے ان کی ذات پر فرانس فخر کرتا تھا۔ فرانس کے بڑے آدمیوں میں تھا، میں نے یہ الفاظ سنے مگر کمال حیرت تھی۔ یہ واقعہ ہی ایسا تھا جیسا کہ کابوس میں بدخوابی ہوتی ہے۔

فرانس کا بڑا شخص مرتے ہی بڑے ہو گئے واہ!

....

وہ شخص جس نے پہلے کہا تھا وہ باآواز بلند باتیں کرنے لگا اور ہر لفظ کے ساتھ طاقت بڑھتی جاتی تھی اور لوگ کمال توجہ سے سن رہے تھے اور جوش بڑھتا جاتا تھا۔ اس مردہ شخص کی صفتیں بیان ہو رہی تھیں اور ان میں بہت مبالغہ کیا جا رہا تھا۔ اب اس کی قدر و قیمت فوراً دریافت ہو گئی اور سب نے تسلیم کر لی۔ نہایت جوش و خروش کے ساتھ، گیسو کے جسم مردہ پر بڑے عزت کے ساتھ ایک عمدہ چادر اڑھائی گئی۔"

('خونی عاشق'، صفحہ ۲۶۳ تا ۲۶۴)

اس وقت فرانسسی عورت کھلنڈرانہ مزاج رکھی تھی جس میں تدبر نام کی کوئی چیز نہیں ہوا کرتی تھی۔ اس کے برعکس انگریز عورت کے انداز گفتار سے وقار ٹپکتا تھا۔ ناول نگار مذکورہ دونوں ملکوں کے نسوانی مزاج کے اس اختلافی پہلو کو بھی پیش نظر رکھا ہے۔

پرسوں میں نے ایک انگریزن کو دیکھا تھا۔ خاصی اچھی صورت تھی۔

نگاہ سے سنجیدگی ٹپکتی تھی۔ وہ معمر آدمی کے ساتھ ٹھنڈی سڑک پر ٹہل رہی تھی۔ وہ یقیناً اس انگریزن کے باپ ہوں گے اور وہ ہر چیز کو ایک سنجیدہ نظر سے دیکھتی تھی، نہ بطور تماشہ اور کھیل کے۔ اس کی رفتار و گفتار میں وہ دور باشی کا نازک انداز تھا جس کا شائبہ ہماری فرانسیسی عورتوں میں نہیں پایا جاتا ہے۔''

('خونی عاشق'، صفحہ ۲۶۰)

مختصر یہ کہ اس ناول میں جنگ کے بعد فرانسیسی معاشرے کی پامالی کا جو حال بیان کیا گیا ہے وہ عبرتناک بھی ہے اور الم انگیز بھی۔ ناول نگار نے ظاہر و باطن کا جو فرق دکھایا ہے اس سے مٹتی ہوئی اخلاقی قدروں کی تفصیل سامنے آتی ہے۔ جنسی نفسیات کی آئینہ داری میں حقیقت پسندانہ اسلوب نمایاں ہے۔ چنانچہ یہ ناول ایک ایسا تاریخی المیہ بن گیا ہے جس میں معاشرتی زندگی کی الجھنیں بھی ہیں اور زوال آمادہ اخلاقی قدروں کی حکایتیں بھی۔

مرزا رسوا نے واقعات کی مناسبت سے اشعار بھی شامل کئے ہیں۔ اس کی وجہ سے ناول کی دلکشی میں اضافہ ہو گیا ہے۔ جہاں ایک طرف اُردو کے بڑے شعراء غالبؔ، میرؔ، ذوقؔ کے اشعار پیش کئے ہیں وہیں نسبتاً غیر اہم شاعر محمد صاحب شکیل کے شعر بھی پیش کئے ہیں۔ اردو اشعار کے ساتھ ساتھ فارسی شعراء کے اشعار بھی موجود ہیں۔ بعض اشعار کئی مرتبہ پیش کئے گئے ہیں۔ مثلاً غالبؔ کا شعر

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ　　　کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

مذکورہ شعر چار جگہوں پر موجود ہے۔ صفحہ ۳۹، ۱۵۰، ۲۸۲ اور ۳۰۸ پر۔ ذوقؔ کا شعر

ہم رونے پہ آجائیں تو دریا بہا دیں　　　شبنم کی طرح سے ہمیں رونا نہیں آتا

مذکورہ شعر دو جگہ ہے۔ صفحہ ۸۴ اور ۳۸۴ پے۔ اس کے علاوہ بھی کئی ایسے اشعار ہیں جو ایک بار سے زیادہ قلم بند کئے گئے ہیں۔

'خونی عاشق' میں کتابت کی غلطیاں اپنے عروج پر ہیں۔ مثلاً صفحہ ۴۲ پر ایک کردار کا نام 'ہیلاٹوس' لکھا ہے۔ اُسی صفحہ پر آگے چل کر اس کردار کا نام 'ہیلا بوس' لکھا

ہے۔ اُسی صفحہ پر اور آگے بڑھیے تو اُسی کردار کا نام 'ہلا بوس' یوں لکھا ہوا ملے گا۔ غرض کہ ایک ہی نام ایک ہی صفحہ پر تین جگہ تین طریقے سے تحریر ہے۔ صفحہ ۴۲ پر ہی ایک کردار کا نام 'سلوین' گوئل' یوں لکھا ہے اور لطف کی بات ہے کہ آگے اُسی سطر میں وہی نام 'سلوین گڈیل' لکھا ملتا ہے۔ یہ ستم صرف مذکورہ دونوں ناموں کے ساتھ نہیں ہے بلکہ بیشتر کرداروں کے نام کے ساتھ روا رکھا گیا ہے۔ مثلاً صفحہ ۱۸ پر 'پالائین' ہے صفحہ ۱۴۳ پر 'پالائن' ہے اور صفحہ ۱۳۷ پر 'پاولاین' صفحہ ۵۵ پر 'کوئیس' لکھا ہے صفحہ ۶۷ پر 'کوئنس' لکھا ہے صفحہ ۱۰۸ پر 'کوئنس'

کتابت وغیرہ کی کوتاہیوں اور خامیوں کے باوجود اپنے موضوع، انداز بیان اور خود مصنف کی فلسفیانہ بصیرت اور نفسیاتی ژرف بینی کے اظہار نے 'خونی عاشق' کو اردو میں اپنی قسم کا پہلا ناول بنا دیا ہے۔ اس کتاب کا تنقیدی مطالعہ واضح کرتا ہے کہ خواہ اس کا مواد جہاں سے بھی لیا گیا ہو اردو میں ایک فنی تخلیق کے اعتبار سے یہ روسی ناول نگار دوستووسکی کے فکر و فن سے ملتا جلتا نمونہ اُردو میں ہے۔ چنانچہ 'خونی عاشق' کا موازنہ بعض جہتوں سے ایک حد تک دوستووسکی کے ناول Crime and punishment سے کیا جا سکتا ہے۔

□□

مرزا رسوا اور ان کی ناول نویسی کا محرک

اصل نام مرزا ہادی تھا لیکن مرزا رسوا کے نام سے مشہور ہوئے۔ ناول 'امراؤ جان ادا' کے منظر عام پر آنے کے بعد مذکورہ عرفی نام کافی مقبول ہوا اور عام و خاص دونوں طبقوں کے ذہنوں پر نقش ہو گیا۔

مرزا رسوا ۱۸۵۷ء میں لکھنو کے محلّہ کوچہ آفریں خاں میں پیدا ہوئے۔ ان کے جداعلیٰ مرزا رشید بیگ ایران سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے تھے اور اس وقت مغلیہ سلطنت کا دور دورہ تھا۔ مرزا رشید بیگ مذکور کے صاحبزادے کا نام ذوالفقار تھا جنہوں نے دہلی کو خیر باد کہہ کر لکھنو میں سکونت اختیار کر لی۔ مرزا رسوا کے دادا آغا ولی مرزا ذوالفقار کے صاحبزادے تھے۔ مرزا رسوا کے نانا نواب محمد علی خاں تھے۔ ان کا عرفی نام آغا شیر تھا جو نواب محسن رضا خاں کے قرابت داروں میں تھے۔

مرزا رسوا نے کم سنی میں کئی موتیں دیکھیں۔ سب سے پہلے ان کے بڑے بھائی محمد ذکی مرے۔ پھر ان کے والد بھی انتقال کر گئے۔ اس وقت مرزا رسوا کی عمر ایسی نہ تھی کہ آفتِ ناگہانی کا تنہا مقابلہ کرتے۔ چنانچہ اپنے ماموں اور خالہ کی سرپرستی میں آ گئے۔ مگر اُنہیں یہاں سکون نہ مل سا۔ کیونکہ ان لوگوں کو زمانے کے دستور کے مطابق مرزا رسوا کے مقابلے ان کی جائداد سے زیادہ دلچسپی رہی۔ حالات سے مجبور ہو کر مرزا رسوا اپنے والد کے ایک دوست شیخ حیدر بخش کے یہاں آ گئے۔ چونکہ یہ حضرت لاولد تھے اس لئے مرزا رسوا جب ان کے یہاں پہنچے تو بڑی شفقت اور محبت سے پیش آئے۔ اپنی اولاد کی طرح انہوں

نے عزیز رکھا۔ کسی چیز کی کمی محسوس نہ ہونے دی لیکن احتیاطاً اپنے مشاغل سے ان کو ہمیشہ دور ہی رکھا۔ بقول منشی ممتاز حسین انہوں نے مرزا رسوا سے کہا تھا کہ

> ''صاحبزادے میرے پاس نہ آیا کرو۔ اس لئے کہ ایک نہ ایک دن پکڑا جاؤں گا اور میرے ساتھیوں پر بھی آنچ آئے گی۔ اپنی استانی سے جتنی ضرورت ہو اتنا خرچ مانگ لیا کرو۔ میرے کوئی آل اولاد نہیں۔ تمہیں سب کچھ ہو۔ جب تک میرا قابو چلے گا تمہیں ننگا بھوکا نہ رکھوں گا۔''
>
> (الناصر، ستمبر ۱۹۳۴ء، صفحہ ۱۱)

مرزا رسوا نے چار شادیاں کی تھیں لیکن اولاد کی خوشی احمدی بیگم سے ہی حاصل ہوئی جس نے ان کے خاندان کا سلسلہ آگے بڑھایا۔ اس بی بی کے بطن سے چھ اولادیں ہوئیں جن میں تقیہ بیگم، آغا ولی اور آغا علی نے طویل عمر پائی۔ پہلی بیوی سے ایک بچی ہوئی تھی لیکن پہلے ماں کا پھر بچی کا انتقال ہو گیا۔ بختاور بیگم مرزا رسوا کی تیسری بیوی تھیں۔ آمنہ بیگم ان کی آخری یعنی چوتھی بیوی تھیں۔ لیکن مرزا رسوا کے یہاں مذکورہ دونوں بیویوں سے کوئی بچہ نہیں ہوا۔

مرزا رسوا فنانی العم شخص تھے عملاً وہ تمام عمر طالب علم رہے۔ بعض علوم مثلاً فارسی، حساب اور اقلیدس کے کچھ مقالے، نجوم اور علم ہیئت کے مبادیات انہوں نے بچپن میں اپنے والد سے پڑھے تھے۔ خوش نویسی میں شیخ حیدر بخش کے شاگرد ہوئے۔ شاعری بھی کی۔ شروع میں مرزا دبیر سے اصلاح لی۔ ان کے انتقال کے بعد مرزا اوج کے شاگرد ہو گئے۔ مرزا تخلص کرتے تھے۔ طب میں مولانا غلام الحسنین کنتوزی سے استفادہ کیا۔ ممتاز حسین عثمانی لکھتے ہیں کہ

> ''صرف و نحو میں عربی میں مولانا محمد یحیٰ لکھنوی اور منطق میں مولانا کمال الدین موہانی سے استفادہ کیا۔''
>
> ('الناصر، ستمبر ۱۹۳۴ء، صفحہ ۱۳ تا ۱۴)

پنجاب یونیورسٹی کا امتحان منشی عالم ایک سال میں پاس کر لیا تھا۔ انگریزی بھی پڑھی۔ میٹرک کا امتحان پرائیوٹ سے دیا تھا۔ پنجاب یونیورسٹی سے ایف اے اور بی اے کے امتحانات بھی پاس کر لئے تھے۔ رڑکی کالج سے اورسیری (Oversser) کی سند حاصل کی انہیں اورینٹل یونیورسٹی کولمبیا واشنگٹن امریکہ سے پی ایچ ڈی کی سند بھی ملی تھی لیکن بقول عزیز لکھنوی :

''اس واقعہ کی اصل معلوم نہیں کیونکر اور کس سلسلے سے''

('زمانہ'، جنوری ۱۹۳۴ء، صفحہ ۱۱)

اس سے قطع نظر منشی مختار حسین عثمانی رقم طراز ہیں کہ

''فلسفہ قدیم و جدید کے تقابل پر ایک مبسوط کتاب انگریزی میں لکھی۔ امریکن یونیورسٹی نے اس کے صلے میں پی ایچ ڈی کا خطاب دیا تھا۔''

('الناصر'، نومبر ۱۹۳۴ء صفحہ ۲۷)

اس سلسلے میں ڈاکٹر آدم شیخ مرتضیٰ حسین موسوی کے کسی غیر مطبوعہ مضمون کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ

''مرزا رسوا نے کرامت علی صاحب کی تصنیف 'علم الاخلاق' مرتب کی تھی۔ یہ کتاب فارسی زبان میں تھی اور بی اے میں پڑھائی جاتی تھی۔ مرزا رسوا نے اس کتاب کا انگریزی ترجمہ کیا تھا اور بعض فارسی اصطلاحوں کا بھی صحیح ترجمہ انگریزی میں پیش کیا۔ یہ کتاب پنجاب یونیورسٹی کے توسط سے امریکہ بھیجی گئی۔ جہاں سے مرزا رسوا کو اس کتاب پر ڈاکٹر آف فلاسفی اور ڈاکٹر آف اورینٹل اسٹڈیز (Doctor of Philosphy and doctor of Oriental Studies) کی ڈگریاں ملیں''۔

(مرزا رسوا حیات اور ناول نگاری صفحہ ۴۹)

مرزا رسوا واقعات عالم سے کس قدر باخبر تھے ملاحظہ ہو :

''گورستان میں قبروں کی اندرونی حالت جن میں کوئی غریب درد سے بے ہوش ہو گیا تھا جسے مردہ سمجھ کر دفن کر دیا گیا تھا اس واقعہ پر روشنی ڈالتے ہوئے مرزا رسوا رقم طراز ہیں کہ ''اس قسم کا ایک واقعہ پیرس کے قریب ۱۸۸۹ء میں ہوا تھا''

('خونی عاشق'، صفحہ ۱۸۷)

اثباتی مذہب کی تشریح کرتے ہوئے مرزا رسوا لکھتے ہیں کہ

''فرانس کے حکیم کومٹ نے یہ مذہب ایجاد کیا تھا کہ جو چیز محسوسات آنکھ، ناک، کان، منہ، زبان وغیرہ سے ثابت نہ ہو اس کو نہ ماننا چاہئے۔ خدا ایسے موجودات میں نہیں ہے جو حواس سے ثابت ہو سکے۔ لہٰذا اس کا ماننا بے کار ہے''

('خونی عاشق'، صفحہ ۲۲۷)

پتھریا جگ پر روشنی ڈالتے ہوئے مرزا رسوا لکھتے ہیں کہ

"پتھر یا جگ (Stone Age) یہ وہ زمانہ انسانی تمدّن کا ہے جب کہ لوہے اور پیتل کی جگہ پتھر کا استعمال تھا۔ اس زمانے کے تیروں کے بھالیں اور ظروف وغیرہ زمین کے بہت نیچے سے محققین یورپ نے کھود کھود کر نکالے ہیں۔"
('خونی عاشق'، صفحہ ۲۰۷)

رافیل کے بارے میں مرزا رسوا لکھتے ہیں کہ

"رافیل ملک اطالیہ کا ایک مشہور مصوّر تھا۔ جس کی تصویر کشی شہرہ آفاق ہے اور کڑوروں روپیہ میں اس کی تصویر فروخت ہوتی ہے۔"
('خونی عاشق'، صفحہ ۲۶۹)

فرقہ کلبیہ پر روشنی ڈالتے ہوئے مرزا رسوا رقم طراز ہیں کہ

"فرقہ کلبیہ یونان میں حکیموں کا ایک گروہ تھا جو سنیاسیوں کی طرح زندگی بسر کرتے تھے اور لوگوں کو جوان کے پاس جاتے تھے بہت گالیاں دیتے تھے اور کتے کی طرح کاٹنے دوڑتے تھے۔ دیو جانس کلبی اس فرقہ کے حکیموں میں بہت مشہور گذرا ہے۔ جو ایک ماند میں رہا کرتا تھا اور اس کو اپنا محل کہتا تھا۔"
('خونی عاشق'، صفحہ ۲۷۷)

مرزا رسوا کچھ عرصے تک صوبہ سرحد (کوئٹہ اور بلوچستان) میں اوور سیری کی تھی۔ نخاس مشن اسکول میں فارسی کے استاد رہے۔ انہوں نے ٹیوشن پڑھانے کا شغل بھی اختیار کیا تھا۔ کہتے ہیں لوہار کے بچے کو محض اس شرط پر پڑھایا کہ دھونکی اور کوئلے شب بھر ان کی تصرف میں رہیں گے۔ ایزابیلا تھیوبرن کالج میں بھی انہوں نے ملازمت کی تھی۔ سنیٹل ہائی اسکول میں بھی مرزا رسوا کا تقرر ہوا تھا۔ کرسچن کالج لکھنؤ میں مرزا رسوا نے ۲۳ سال تک ملازمت کی۔ آخر عمر میں دار الترجمہ جامعہ عثمانیہ حیدر آباد سے وابستہ ہو گئے تھے۔

مرزا رسوا ذہین اور صاحبِ نظر تھے۔ تذکرہ نویس نے اس باب میں کئی واقعے تحریر کئے ہیں جن میں سے کچھ یہاں درج کئے جاتے ہیں۔ علی عباس حسینی نے مرزا رسوا کی ذہانت کا ذکر اس طرح کیا ہے:

"کالج میں جس مضمون کو پڑھانے والا پروفیسر نہ آیا مرزا صاحب بھیج دیے گئے۔ تاریخ، منطق، فلسفہ، ریاضی، سائنس مرزا صاحب جس درجے میں پہونچے۔ انہوں نے مضمون کے متعلق کچھ سوالات کئے۔ بس اسی موضوع پر سبق ہونے لگا۔ ایک بار نہیں کئی بار ایسا ہوا کہ ایم ایس سی کو ریاضی پڑھانے والے بنگالی پروفیسر گھبرائے درجے میں آئے۔ ہم لوگوں نے کھڑے ہو کر

تعظیم کی۔ مرزا صاحب نے دراز سے چاک نکالا ان سے پوچھ پوچھ کر تختہ سیاہ پر سوال لکھا اور بے تامل اسے حل کرتے چلے گئے۔''

('نقوش' شخصیات نمبر صفحہ ۷۰)

ڈاکٹر آدم شیخ مرزا رسوا کی ذہانت کے بارے میں رقم طراز ہیں کہ

''مرزا رسوا نے اس وقت کیمسٹری میں مہارت حاصل کی جب یہ ہندوستان میں کہیں نہیں پڑھائی جاتی تھی۔ اس کے لئے مرزا رسوا نے کتابیں وغیرہ لندن سے منگائیں تھیں۔ سید جعفر حسین انجینیر کے بڑے بھائی میر محمد حسین ہندوستان ایگری کلچر ڈپارمنٹ کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر تھے۔ میر محمد حسین لندن کے تعلیم یافتہ تھے۔ ان کا صدر دفتر کانپور میں تھا۔ ان کی دفتری مصروفیات حد سے زیادہ تھیں۔ اس پر حکومت نے مٹی کے تجربہ کا کام بھی انہیں کے سپرد کیا۔ ایک مرتبہ سید جعفر حسین کانپور گئے تو ان سے تذکرہ کیا۔ سید جعفر حسین نے امداد کے لئے مرزا رسوا کا نام پیش کیا۔ لیکن جب میر محمد حسین کو یہ معلوم ہوا کہ مرزا رسوا لندن سے کیمسٹری پڑھ کر نہیں آئے ہیں تو انہوں نے انکار کر دیا تاہم جعفر حسین کے اصرار پر تجربے کے طور پر انہیں بلایا۔ دوسری ملاقات میں میر محمد حسین نے اپنے چھوٹے بھائی کو بتایا کہ مرزا رسوا کیمسٹری میں اس قدر مشاق ہیں کہ بڑے بڑے لندن کے پروفیسر بھی اس قابلیت کے نہیں۔ ہر مٹی کی خاصیت تین تجربوں میں معلوم کر لیتے ہیں۔''

('مرزا رسوا حیات اور ناول نگاری' صفحہ ۵۹)

مذکورہ واقعات سے قطع نظر 'خونی عاشق'، 'خونی جورو'، 'خونی شہزادہ' اور 'بہرام کی رہائی' کے مطالعہ کے بعد یہ نتیجہ اخذ کرنا زیادہ دشوار نہیں ہے کہ مرزا رسوا کا حافظہ واقعی قوی تھا۔ انہیں سینکڑوں اشعار یاد تھے۔ جس کی بدولت انہوں نے مذکورہ تمام ناولوں میں واقعات کو ملحوظ رکھتے ہوئے اشعار موزوں کئے ہیں جس کی وجہ سے ناولوں کی دلکشی بڑھ گئی ہے۔ مرزا رسوا نے جہاں ایک طرف اردو کے مشہور شعراء غالب، میر تقی میر اور ذوق وغیرہ کے اشعار پیش کئے ہیں وہیں قدرے کم مشہور شاعر محمد شکیل صاحب کے بھی شعر نقل کئے ہیں۔ ان کا حافظہ اس قدر مضبوط تھا کہ انہیں فارسی شعراء کے اشعار بھی کثرت سے ازبر تھے اشعار خواہ فارسی کے ہوں یا اردو کے مرزا رسوا نے انہیں اپنے ناولوں میں استعمال کر کے زیادہ حسین اور دلکش بنا دیا ہے۔ یہی وہ خوبی ہے جس سے مرزا رسوا کی ذہانت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ملاحظہ ہو :

"گیستن بودیس کی مفلوک الحالی دیکھ کر ہیلا روس جب اس سے حیرت زدہ لہجے میں استفسار کرتی ہے اور وہ کہتا ہے کہ میں ہی گیستن بودیس ہوں۔ اس واقعہ کا نقشہ مرزا رسوا نے جہاں نثر کے ذریعہ کھینچا ہے وہیں شعر کے ذریعہ بھی واضح کیا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاعر نے اسی موقع کے لئے شعر کہا تھا۔

میرے تغیر حال کو مت پوچھ
اتفاقات ہیں زمانے کے

مرزا رسوا کو اردو زبان سے ایک خاص لگاؤ تھا۔ حیدر آباد کے قیام کے دوران علی عباس حسینی ان سے ملنے گئے تو مرزا رسوا کے پاس قصہ حاتم طائی دیکھا۔ وجہ پوچھی تو جواب ملا کہ

"میاں حیدر آباد میں بھانت بھانت کی بولیاں سنتے سنتے اردو بھول جاتا ہوں۔ یہاں آ کر انہیں پڑھ کر پھر سے زبان پر صیقل کرتا ہوں۔"

('نقوش'، شخصیات نمبر، صفحہ ۱۷)

مرزا رسوا نماز اور روزے کے بڑے پابند تھے۔ آخر عمر تک انہوں نے نماز قضا نہ کی۔ پیرانہ سالی میں ضعف کے سبب بیٹھ کر نماز پڑھتے تھے۔ جب تک بدن میں طاقت رہی روزہ کا اہتمام پابندی سے کرتے تھے۔ منشی ممتاز حسین عثمانی کا بیان ہے کہ

"۱۹۰۲ء میں وہ میرے مکان کے متصل مقیم ہوئے اسی وقت سے نماز پابندی کے ساتھ پڑھنے لگے۔ پھر مرتے دم تک نہ چھوڑی۔ جب تک طاقت بحال رہی روزے بھی رکھے۔ طاقت گھٹی اور بیٹھ کر پڑھنے لگے۔"

('الناصر'، نومبر ۱۹۳۴ء، صفحہ ۲۸)

مرزا رسوا کو اسلام مذہب سے والہانہ عشق تھا۔ وہ ذات خداوندی کو تمام عیوب سے پاک سمجھتے تھے۔ خدا کو مورد الزام ٹھہرانے والوں سے انہیں سخت نفرت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ مرزا رسوا ناول میں بھی خدا سے کی جانے والی دل لگی مطلق برداشت نہیں کر پاتے اور تردید کرنا ضروری سمجھتے تھے۔ مثلاً Worm Wood کی مصنفہ ایک جگہ لکھتی ہیں کہ "ہر چیز خدا کی بنائی ہوئی ہے برائی بھی۔" مرزا رسوا کی عقیدت سے سرشار نظریں اس مقام پر ٹھہر جاتی ہیں اور ذہن فوراً تردید کرنا ضروری سمجھتا ہے ملاحظہ ہو :

"یہ خیال غلط ہے کہ خدا برائی بناتا ہے۔ برائی کا وجود منفی ہے وہ ایک حالت ہے جو بھلائی کے نہ ہونے سے پیدا ہوتی ہے۔ منفی چیز کے بنانے کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ یہ فلسفہ ورم وڈ کی مصنفہ نہیں سمجھیں یا اس

کا ہیرو بے وقوف تھا۔ جو ہر برائی کو خدا کی طرف منسوب کرتا ہے۔ ایک طرح سے برائی کا سبب بھی خدا ہے لیکن اس طرح جیسے کوئی لڑکا چوری کرے تو اس کے باپ دادا بھی چونکہ لڑکے کے پیدا ہونے کا سبب ہیں اس چوری کے باعث ہوئے مگر وہ اس چوری کے لئے ماخوذ نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح مخلوق سے اگر کوئی برائی ہو تو اس کے لئے خدا پر الزام نہیں لگایا جا سکتا ہے۔''

('خونی عاشق'، صفحہ ۲۳۸)

ورم وُڈ کا ہیرو جب یہ کہتا ہے کہ

''یہ دنیا ہے اور دنیا کی زندگی ہے اور خدا اس کی ترقی کے لئے کوئی کوشش نہیں کرتا ہے''

('خونی عاشق'، صفحہ ۲۳۵)

مرزا رسوا کا جذبۂ عقیدت اس بے بنیاد الزام کی تردید اس طرح کرتا ہے :

''اس ناول کا ہیرو سخت بے وقوف ہے۔ شاید اس نے کبھی کوئی شریفانہ فلسفہ کی کتاب آنکھ کھول کر نہیں پڑھی۔ وہ ہر جگہ خدا کو الزام دیتا ہے۔ اصل سوال یہ ہے کہ دنیا کو آزاد بنانا چاہئے تھا یا مجبور جب کہ آزادی کی دھوم مچی کون کہہ سکتا ہے دنیا کو آزاد نہ بنانا تھا۔ اگر کوئی یہ تجویز کرے کہ دنیا کو مجبور بنایا ہوتا تو شاید آزادی کے پجاری اس کو پاگل بتائیں گے۔ پھر جبکہ دنیا تمہاری مرضی کے موافق آزاد بنائی گئی تو یہ ناممکن ہے کہ انسان کی آزادی میں دخل دے کے عالم کا انتظام الٹ پلٹ کر دیا جائے۔ پس یہاں آدمی ہی جو چاہتا ہے کر لیتا ہے۔ آزاد بننے کا نتیجہ یہی ہے کہ لوگ اپنے فعل کے مختار ہوں۔ اس صورت میں جو کچھ برائیاں ہوتی ہیں اس کا الزام خود انسان پر ہے نہ کہ خدا پر۔ اگر مجبور بناتا اور آدمی فاعل مختار نہ ہوتا تو بے شک خدا پر الزام آ سکتا تھا۔ یہ مسئلہ قابل سمجھنے کے ہے سمجھو۔''

آخری جملے سے مرزا رسوا کی جہاں خدا سے عقیدت جھلکتی ہے وہیں یہ بھی عیاں ہو جاتا ہے کہ وہ اس قسم کی باتوں سے کس قدر برہم ہوتے تھے۔

مرزا رسوا کو کتابوں کے مطالعہ کا شوق جنون کی حد تک تھا خواہ شعرا کا دیوان ہو، فلسفہ کی کتاب ہو یا مذہبی کتاب۔ 'خونی عاشق' کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ مرزا رسوا نے انجیل کا بھی مطالعہ کیا تھا۔ مذکورہ کتب بینی کے شوق کی وجہ سے مرزا رسوا کے پاس کتابوں کا بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا تھا۔ جس میں کچھ نایاب اور کم یاب کتابیں بھی شامل تھیں۔ مرنے سے

قبل حفاظت کے خیال سے اپنی بیشتر کتابیں مدرسہ الواعظین کو دے ڈالی تھیں۔

مرزا رسوا نے ۲۱/ اکتوبر ۱۹۳۱ء کو انتقال کیا۔ حیدر آباد میں تڑپ بازار راجہ مرلی دھر کے باغ کے پیچھے دفن ہوئے۔

مرزا رسوا کی ناول نویسی کا محرک ان کے عشق کی ناکامی ہے۔ خالہ زاد بہن سے شادی کی خواہش پوری نہ ہونے کی وجہ سے ان کے دل میں خلش تھی اسے کم کرنے کی غرض سے انہوں نے 'افشائے راز' لکھا۔ یہ ان کا پہلا ناول ہے جو ۱۸۹۶ء میں شائع ہوا۔ مرزا رسوا کے حالات زندگی کو ذہن میں رکھ کر جب ہم 'افشائے راز' کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ مذکورہ ناول میں رونما ہونے والے واقعات مرزا رسوا کی زندگی سے کافی مماثلت رکھتے ہیں۔ خاص کر بگن کا کردار مرزا رسوا کی پہلی چاہت 'خالہ زاد بہن' کا پرتو ہے اس میں شبہ کی گنجائش بالکل نہیں ہے۔ مرزا رسوا پر ہر وقت تجربات و ایجادات کا جنون سوار رہتا تھا لیکن ان کی ضروریات زندگی کبھی کبھی مجبور کرتی تھی تو روپیوں کی خاطر مہادیو پرشاد ورما کے لئے ناول لکھتے تھے۔ یہ شخص اس تاک میں رہتا کہ کب مرزا رسوا کو پیسے کی حاجت ہو اور وہ اس سے مدد کے طالب ہوں۔ وہ مرزا رسوا سے ناول لکھوا کر یا ترجمہ کرا کر ان کی مالی مدد کر دیا کرتا تھا مذکورہ بات کی تصدیق اس طرح بھی ہو جاتی ہے کہ مندرجہ ذیل کتابیں مہادیو پرشاد ورما نے شائع کروائیں:

(۱) ذات شریف (۲) شریف زادہ (۳) امراؤ جان ادا (۴) اختری بیگم (۵) خونی عاشق (۶) خونی جورو اور (۷) خونی شہزادہ

لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ عشق کی ناکامی سے مرزا رسوا کی ناول نویسی کا آغاز ہوا جسے ضروریات زندگی نے مزید بڑھاوا دیا۔ مہادیو پرشاد ورما کی وجہ سے مرزا رسوا نے اتنے سارے ناول لکھے ورنہ ان سے یہ توقع ہرگز نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ ناول لکھ کر انہیں چھپوانے کی بھی فکر کرتے۔ مرزا رسوا کا دیوان ان کی شان بے نیازی کی وجہ سے نامکمل رہ گیا۔ 'افشائے راز' اور 'اختری بیگم' بھی نامکمل حالت میں پائے جاتے ہیں۔ علی عباس حسینی نے مرزا رسوا کے بارے میں بالکل صحیح لکھا ہے کہ

"ان کے لئے فنون لطیفہ کی تصنیف ایک اضطراری فعل تھا۔ بالکل وقتی تفنن کی چیز۔"

علامہ واقفؔ عظیم آبادی کی شخصیت کے مخفی پہلو

اصل نام سیّد شاہ فضل امام لیکن واقفؔ عظیم آبادی کے نام سے مشہور ہوئے۔ اُن کی پیدائش ۱۸؍مارچ ۱۹۱۴ء کو ضلع جہان آباد کے قصبہ ارول میں ہوئی۔ ان کے والد سیّد شاہ منظر امام ارول کے رہنے والے تھے۔ واقفؔ عظیم آبادی کی نانیہال آرا اور دادیہال ارول تھی۔ دنوں طرف سے ان کا خاندان متموّل تھا۔ آرا میں واقفؔ عظیم آبادی کا شمار باحیثیت لوگوں میں ہوتا تھا۔ اُن کے یہاں اللہ کا دیا ہوا سب کچھ تھا مگر زندگی کے آخری ایام میں مصائب میں ایسے گھرے اور وقت کا مزاج ایسا بدلا کہ بدن پر جو کپڑا تھا وہ صرف جسم ڈھکنے کی حد تک تھا۔ کاندھے پر کمبل اور ہاتھ میں چھڑی جہاں جاتے ساتھ لے جاتے اُنہیں نہ تو ناشتے کی فکر تھی اور نہ کھانے کی پرواہ، کھانا میسّر آ گیا تو کھا لیا ورنہ صبر و شکر پر اکتفا کیا۔

واقفؔ عظیم آبادی کی شخصیت بظاہر جیسی ہو لیکن وہ ایک کامل بزرگ تھے۔ ان کی شخصیت کے کئی پہلو تھے۔ جو جتنا ان کے نزدیک آیا اس نے اتنا ہی انہیں پہچانا۔ علامہ کچھ ایسے صفات کے مالک تھے کہ اُنہیں آنے والے واقعات کا پہلے ہی علم ہو جاتا تھا۔ ان کی واقفیت اور علم سے متعلق ایک واقعہ قابلِ ذکر ہے کہ پروفیسر مرتاض الدین مرحوم سے علامہ کو خاص انسیت تھی۔ وہ اکثر و بیشتر پروفیسر صاحب کے داناپور واقع مکان پر قیام کرتے تھے۔ سنہ ۱۹۷۵ میں جب وہ ان کے مکان پر گئے تو مرتاض الدین سے فرمایا کہ لاؤ کاغذ اور قلم، ایک دعا لکھ لو۔ یہ دعا تمہیں سیلاب سے محفوظ رکھے گی۔ پروفیسر صاحب

پش وپیش میں پڑ گئے۔ اس وقت کسی کو گمان بھی نہیں تھا کہ پٹنہ میں ہلاکت خیز سیلاب بھی آئے گا بہر کیف علامہ کا حکم تھا لہٰذا وہ ٹال نہ سکے۔ کاغذ اور قلم لے آئے۔ انہوں نے دعا لکھ لی۔ عین ایک ہفتہ کے بعد پٹنہ میں سیلاب کا پانی چڑھ آیا۔ پروفیسر صاحب کے گھر کی چار سیڑھیاں زیر آب ہوگئیں۔ اب اور تب پانی کمروں میں داخل ہونے کو تھا کہ انہیں علامہ کی وہ دعا یاد آ گئی اور انہوں نے دعا پڑھنی شروع کی۔ اللہ کی شان یہ ہوئی کہ رات سے پانی اترنا شروع ہوگیا۔ الغرض علامہ کو پہلے ہی علم ہوگیا تھا کہ پٹنہ میں سیلاب آنے والا ہے لہٰذا انہوں نے مرتاض الدین کو سیلاب سے محفوظ رکھنے کی دعا عنایت کی جو پورے شہر کی عافیت کا سبب ہوئی۔

علامہ درویشانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ نام ونمود کے وہ طالب نہیں تھے۔ میں اکثر ان سے ملتا تھا۔ ایک دن انہوں نے مجھ سے کہا کہ میاں تم اگر اپنے انگوٹھے کے ناخون پر کسی کی تصویر دیکھنا چاہتے ہوتو اِسے اپنے ذہن میں رکھو، علامہ کے خاموش ہوتے ہی میں نے کہا اچھا آپ میرے ذہن کی مطلوبہ تصویر دکھلایئے۔ انہوں نے اپنی دونوں آنکھیں بند کیں۔ تھوڑے وقفے کے بعد انہوں نے اپنی آنکھیں کھولیں اور فرمایا کہ انگوٹھے کے ناخون پر دیکھو۔ مجھے اُس وقت سخت حیرت ہوئی کہ واقعی انگوٹھے کے ناخون پر امتیاز کی تصویر موجود تھی جبکہ وہ دہلی میں رہتے تھے۔ علامہ نے اس علم پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ انڈمن نکوبار سے ایک بزرگ پٹنہ آئے تھے اور انہوں نے مجھے تلاش کر کے یہ علم سکھایا تھا اور کہا تھا کہ اب میرا چل چلاؤ ہے لہٰذا تم اس فن سے واقف ہو جاؤ تا کہ میرے بعد یہ فن زندہ رہے۔

علامہ ایک صوفی صفت آدمی تھے۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ کی دوری طے کرنے میں انہیں سواری کی حاجت نہیں ہوا کرتی تھی۔ عبدالغفور مرحوم ومغفور وزیر اعلیٰ بہار اکثر و بیشتر دہلی آتے جاتے تھے۔ ایک روز کا واقعہ ہے کہ وہ دہلی میں تھے کہ انہوں نے دوپہر میں دہلی کی سڑکوں پر چلتے ہوئے علامہ کو دیکھا اسی دن وہ ہوائی جہاز سے شام کو پٹنہ آ گئے تو انہوں نے علامہ کو پٹنہ میں موجود پا کر حیرت میں پڑ گئے۔ کچھ دنوں کے بعد ان کی ملاقات علامہ سے ہوئی تو انہوں نے اپنی حیرت کا اظہار کیا۔ علامہ نے انہیں منع کیا کہ دوبارہ اس کا ذکر کسی سے نہیں کیجئے گا جو دیکھا سو دیکھا اب اسے بھول جایئے۔

ایک بار کا واقعہ ہے کہ میں اور پروفیسر مصلح الدین بدھ دیو سنگھ (وزیر عبدالغفور

کابینہ) کے سرکاری کوارٹر میں تھے۔ دوپہر کا وقت تھا۔ بھوک محسوس ہوئی تو ہم لوگ چت کوڑہ کھانے کی غرض سے نکلے۔ چت کوڑہ مین روڈ پر ہم لوگ آئے ہی تھے کہ علامہ پر نظر پڑگئی۔ کاندھے پر کمبل ہاتھ میں چھڑی۔ خراماں خراماں پیدل چلے آرہے تھے۔ وہ جب قریب آئے تو ہم لوگ ان کی طرف لپکے۔ علیک سلیک کے بعد مصلح الدین نے دریافت کیا کہ حضور کہاں سے آرہے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ زیارت کے لئے پھلواری شریف گیا تھا۔ گفتگو نے مزید طول پکڑا، ادھر بھوک سے ہمارا برا حال ہورہا تھا۔ اسی دوران علامہ نے تھیلہ میں ہاتھ ڈالا اور دو عدد الا یچی دانا نکال کر ہم دونوں کو دیا اور کہا کہ اسے کھالو۔ بھوک اپنے شباب پر تھی لہٰذا الا یچی دانا کھانے میں ہم لوگوں نے دیر نہیں کی۔ بلا مبالغہ الا یچی دانا کھاتے ہی بھوک کا احساس جاتا رہا۔ کچھ دیر کے بعد علامہ پیدل ہی اپنی منزل کی جانب چل دیئے۔

پروفیسر مصلح الدین علامہ کے عزیزوں میں تھے۔ جاڑے کا موسم تھا علامہ نے نہاری کھلانے کی فرمائش کی۔ دن مقرر ہوا۔ صبح سویرے مصلح الدین واقف عظیم آبادی کے کمرے میں پہنچے۔ ان دنوں علامہ کا قیام دریاپور مسجد کے نزدیک سنگم کے دفتر میں ہوا کرتا تھا۔ وہ جب کمرے میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ ٹیوب لائٹ جل رہی تھی اور واقف صاحب کمبل میں منہ چھپائے لیٹے ہوئے ہیں۔ جب انہوں نے اپنی آمد کی جانکاری دی تو علامہ نے کمبل کے اندر سے ہی فرمایا میاں کرسی پر بیٹھو چلتا ہوں۔ وہ کرسی پر بیٹھ گئے۔ کچھ ہی وقفہ گذرا تھا کہ انہوں نے چہرے سے کمبل ہٹایا پھر ڈھک لیا۔ بقول مصلح الدین اس وقت ان کا چہرہ اس قدر منور تھا کہ ٹیوب لائٹ کی روشنی پھیکی لگ رہی تھی۔

علامہ واقف طبعاً درویش تھے۔ ان کا دل نہایت ہی حساس تھا۔ ان سے دوسروں کی تکالیف دیکھی نہیں جاتی تھی۔ وہ ہر لمحہ دوسروں کو تکالیف سے نکالنے کی تدابیر سوچتے رہتے تھے۔

ایک دن میں علامہ کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا کہ انہوں نے فرمایا کہ صدرو کی بہن کا تبادلہ پٹنہ کروانے کی کوشش کرو، عورت ذات ہے، اسکول بہت دور ہے لہٰذا اُسے آنے جانے میں بہت پریشانی ہوتی ہے۔ دوسرے دن علامہ نے صدرو سے کاغذ طلب کیا اور تبادلہ کی ذمہ داری مجھے سونپی۔ میں نے تبادلہ کے لئے تگ و دو شروع کی جس میں مجھے کامیابی ملی۔ یہ خبر جب انہیں دی تو علامہ نے فرمایا کہ رمنہ روڈ میں فلاں مکان میں صدرو

کی بہن رہتی ہے اس کے ہاتھ میں تبادلہ کا کاغذ جا کر دے دو۔ تلاش کے بعد مطلوبہ مکان ملا۔ آواز لگائی تو ایک ادھیڑ عمر کی عورت دروازے پر آئی میں نے کہا کہ استانی صاحبہ کو بلائیے ان کے ہاتھ میں تبادلے کا کاغذ دینا ہے علامہ واقف عظیم آبادی نے تاکید کی ہے۔ یہ سنتے ہی محترمہ نے فرمایا کہ وہ استانی میں ہی ہوں۔ علامہ سے جب اس کا ذکر کیا کہ استانی صاحبہ عمر کا اچھا خاصا حصّہ طے کر چکی ہیں اور ابھی بھی کنواری ہیں۔ یہ سنتے ہی علامہ کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ تھوڑی دیر خاموش رہے پھر فرمایا مسلم معاشرے کی بے حسی اور بدبختی کا یہ شرمناک پہلو ہے، تم نے تو صرف ایک ہی کو دیکھا ہے میں ایسی کئی لڑکیوں کو جانتا ہوں جو اس شہر میں شادی کی عمر پار کر چکی ہیں۔

علامہ واقف عظیم آبادی کو اللہ سے شکوہ کرنے والا انسان پسند نہیں تھا۔ ایک دن کا واقعہ ہے کہ علامہ کا قیام بی ایم داس روڈ میں جج صاحب کے مکان میں تھا۔ صبح ۸ بجے تھے کچھ لوگ پہلے سے بیٹھے ہوئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد صدرو آ گئے اُسے دیکھتے ہی انہوں نے فرمایا، ''میاں کیسے ہو۔'' علامہ کے خاموش ہوتے ہی صدرو نے خفگی بھرے انداز میں کہا کہ ''کیا خیریت پوچھتے ہیں اللہ کا سارا عذاب میرے ہی سر پر ہے۔'' یہ سنتے ہی علامہ چراغ پا ہو گئے اور چھڑی پکڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کی چھڑی صدرو کے بدن پر گرنے ہی والی تھی کہ میں درمیان میں آ گیا اور علامہ کو کسی طرح کرسی پر بیٹھایا۔ وہ اس وقت آپے سے باہر تھے۔ انہوں نے صدرو کو ڈانٹ کر کہا، ''کمبخت مجھے دیکھ۔ میرا کتا جو کھاتا تھا وہ اچھے اچھوں کو میسّر نہیں تھا۔ مجھے زندگی میں ہر قسم کی آسائش نصیب تھی۔ کئی بنگلے اور کوٹھیاں میری ملکیت میں تھیں۔ لیکن آج مجھے نہ رہنے کا ٹھکانہ ہے اور نہ کھانے کا اس کے باوجود میں نے آج تک اللہ سے کوئی شکوہ نہیں کیا، تو بد بخت ایسا ہے کہ ذرا سی تکلیف کیا ہوئی کہ اللہ کا شکوہ میرے سامنے کرنے لگا۔ میں نے علامہ کو اس سے پہلے اتنے غصّے میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ان کا غصّہ جب ٹھنڈا ہوا تو وہ مجھ سے مخاطب ہوئے اور مخدوم شرف الدین احمد یحیٰی منیریؒ کے کچھ واقعات بیان کئے اور ان کی بزرگی اور عظمت پر روشنی ڈالی۔ اس کے بعد انہوں نے پاکٹ سے کاغذ کا ٹکڑا نکالا اور ایک قصیدہ پڑھ کر سنایا جسے انہوں نے مخدومؒ کی شان میں قلم بند کیا تھا۔

□□

پروفیسر محمد مصلح الدّین۔ تعارف و تجزیہ

پروفیسر محمد مصلح الدّین کی پیدائش یکم جنوری، ۱۹۴۵ کو لودی پور (متصل منیر شریف) میں ہوئی۔ اُن کے والد اپنے علاقے کی معروف شخصیت میں شمار کئے جاتے تھے۔ یہ بستی پٹنہ سے تیرہ میل پچھم پٹنہ آرہ شاہراہ پر آباد ہے۔ اُس کے اتر میں دریائے سون کی ایک سوت بڑی آب و تاب کے ساتھ اس کے کنارے سے گزر کر پٹنہ میں دریائے گنگا سے مل جاتی ہے۔ لودی پور کے پچھمی حصّہ میں مسلمانوں کی اچھی خاصی آبادی تھی اور یہاں کا مسلم طبقہ خوشحال اور مطمئن تھا۔ لیکن یہ بستی ۱۹۴۷ء میں فساد کی بھینٹ چڑھ گئی اور فلک نے اِسے لوٹ کر ویران کر دیا۔ گرچہ یہاں کے مسلمانوں کا جانی نقصان نہیں ہوا لیکن مالی اعتبار سے یہاں کے مکینوں کی کمر ٹوٹ گئی اور جس کا جہاں سینگ سمایا، وہاں چلا گیا۔ پروفیسر محمد مصلح الدّین کے والد بھی ہجرت کر کے بیاپور چلے گئے اور مستقل سکونت اختیار کر لی۔ اِس بستی کے لب سڑک ایک منہدم مسجد آج بھی ہے۔ جو لودی پور کے مسلمانوں کی تباہی و بربادی کا ماتم کر رہی ہے۔

پروفیسر محمد مصلح الدّین زندگی کو ہنس ہنسا کر گذار دینے میں یقین رکھتے ہیں۔ یہ غم کے پرستار نہیں بلکہ زندگی کے لئے رعنائی و دلکشی اور رنگینی و شگفتگی کو اس کا جوہر تسلیم کرتے ہیں۔ وہ حیات کو جنت بداماں کرنے کے لئے روحانی توانائی اور اعلیٰ انسانی قدروں کے بھی طرفدار ہیں۔ انہوں نے انسانی لغزشوں کا بھی اعتراف کیا ہے اور بشری

کمزوریوں سے بھی واقف ہیں۔ کوئی سادھو سنت یا فرشتہ نہیں بلکہ ان کی شخصیت عام لوگوں کی طرح سادہ، سہل اور ایک کھلی ہوئی کتاب ہے۔ پروفیسر محمد مصلح الدّین کا قد میانہ، جسم گوشت سے بھرا ہوا، رنگ گندمی، سر پر چھوٹے چھوٹے بال، بھوئیں گھنی، چہرہ تراشیدہ، ناک کھڑی اور آنکھیں روشن ہیں جو جھانک کر دیکھنے والوں کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں۔ مطالعہ کے وقت ان کی آنکھوں پر خوب صورت فریم کی عینک چڑھی رہتی ہے۔ یہ صاف اور ستھرے لباس کے شائقین ہیں۔ ان کی خاموشی میں پہاڑ کا سکوت اور گفتگو میں دریا کی روانی ہے۔ خوش گفتار ایسے کہ سننے والوں کو اپنی طرف متوجہ کرلیں۔ اگر کبھی ہنسی دل لگی کی بات کی تو خندہ زیرلبی سے آگے نہ بڑھے۔ جس محفل میں بیٹھ گئے اسے زعفران زار کردیا۔ بڑوں میں بڑوں کی سی گفتگو اور بچوں میں بچوں کی سی باتیں کرتے ہیں۔

پروفیسر محمد مصلح الدّین بچپن سے ذہین تھے۔ چار سال کی عمر میں مدرسہ بیاپور میں داخل کیے گئے جہاں مولوی ضمیر الدین صاحب مرحوم سے عربی، فارسی اُردو اور خط شکستہ کی تعلیم حاصل کی اور اپنے والد ماجد سے حساب، ہندی اور انگریزی کا درس لیا۔ مدرسہ سے فراغت کے بعد منیر ہائی اسکول میں اُنہیں داخل کرادیا گیا جہاں سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد کالج میں داخل ہوئے اور بی اے آنرز کر کے پٹنہ یونیوسٹی سے ایم اے کیا اور ڈاکٹریٹ کی ڈگری سے بھی سرفراز ہوئے۔ پروفیسر محمد مصلح الدّین کو اپنے وقت کے نامی گرامی اساتذہ اختر اورینوی، جمیل مظہری، صدرالدین فضا شمسی،، ڈاکٹر یوسف خورشیدی، ممتاز احمد اور کلیم عاجزؔ سے تعلیم حاصل کرنے کا فخر حاصل ہے۔ پروفیسر محمد مصلح الدّین نے کلیم الدین احمد کے تنقیدی فکر وخیال اور اصول ونظریات سے بھی فیض حاصل کیا ہے۔

پروفیسر محمد مصلح الدّین کی شادی حکیم نعمان حیدر مرحوم سابق فزیشین ہمدرد دوا خانہ دہلی کی بڑی صاحبزادی سے محلہ پیر بہور، پٹنہ میں ہوئی۔ ان کے سسر کے والد حکیم ہاشم صاحب مرحوم ایک مشہور طبیب تھے جن کے مطب میں اکثر جناب عبدل المنان بیدل، حافظ محمد شمس الدین منیری، ایوب صاحب ایڈوکیٹ اور سیّد حسن صاحب کا اٹھنا بیٹھنا ہوا کرتا تھا۔

پروفیسر محمد مصلح الدین کے چار بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ اُنہوں نے اپنے بچوں کی تعلیم میں کبھی کوتاہی نہیں کی اور اپنی تنخواہ کا اچھا خاصہ حصہ ان کی تعلیم پر خرچ کیا۔ گرچہ انہوں نے دوسروں کے بچوں کو پڑھایا لیکن اپنے بچوں کو پڑھانے سے گریز کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک دفعہ جب وہ اپنے بچوں کو پڑھا رہے تھے تو ایک بچہ اڑیل ٹٹو بن گیا پھر کیا تھا اسے راہ راست پر لانے کے لئے ایسی پٹائی کی کہ ہلدی چونا کی نوبت آگئی۔

پروفیسر محمد مصلح الدین کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہیں آسانی سے بیوقوف بنایا جا سکتا ہے۔ میں نے جب بھی دوسروں کے منہ سے یہ بات سنی تو مجھے سخت حیرت ہوئی کہ آخر ان کے جیسا جہاں دیدہ کیونکر بیوقوف بن جاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک صبح میں کسی کام سے ان کے دولت خانہ پر پہونچا کیونکہ یہی ان سے ملنے کا وقت ہے۔ اس لئے کہ جب وہ گھر سے نکل جاتے ہیں تو شہر میں چاروں کھونٹ گھومتے ہیں۔ میں صبح میں جب ان کے گھر پہونچا تو انہوں نے بڑی شفقت سے مجھے کرُسی پر بیٹھایا اور خود ہاتھ منہ دھونے باتھ روم چلے گئے۔ ابھی کچھ ہی وقفہ گزرا تھا کہ ایک صاحب کرتا پائجامہ میں ملبوس، داڑھی کے بال بڑھے ہوئے، جن کے چہرے سے پریشانی جھلک رہی تھی آدھمکے اور ہانک لگائی ''مصلح الدین صاحب گھر پر ہیں۔'' میں نے ان سے نرمی سے کہا، ہاں ہیں، تشریف لائیے۔ اتنا کہنا تھا کہ وہ لپک کر کرُسی پر براجمان ہو گئے۔ میں نے ان صاحب کے چہرے کو بغور دیکھا تو نہ جانے کیوں ایسا لگا کہ یہ آدمی شاطر ہے۔ میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ پروفیسر محمد مصلح الدین باتھ روم سے نکل کر باہر آئے۔ ان کے آتے ہی وہ صاحب بڑی سرعت سے ان کی طرف بڑھے اور گرم جوشی سے مصافحہ کیا اور معانقہ کی دھن میں تھے کہ صاحب خانہ نے اس کا موقع نہ دیا۔ اس شخص نے بڑی ہمدردی سے پروفیسر محمد مصلح الدین کی خیریت دریافت کی اور جس مقصد سے آئے تھے اس موضوع کو چھیڑ دیا۔ وہ کہنے لگے کہ حضور میں آپ کو اپنے ادارے کا صدر بنانا چاہتا ہوں اور آپ کی رضامندی کے لئے حاضر ہوا ہوں۔ اس کے بعد انہوں نے صاحب خانہ کی تعریف کے پُل باندھ دیئے لیکن پروفیسر محمد مصلح الدین کو مرعوب ہوتا ہوا نہ دیکھ کر وہ اپنے اصل مقصد پر آگئے۔ انہوں نے ان سے کہا کہ آپ مذکورہ ادارہ کے صدر ہو جائیں، ادارہ کو آپ کی ضرورت ہے۔ فی الحال

آپ کچھ مالی مدد کر دیجئے تا کہ لیٹر پیڈ اور کچھ ضروری کاغذات چھپوالیا جائے۔ ابھی وہ صاحب خاموش بھی نہیں ہوئے تھے کہ پروفیسر محمد مصلح الدّین اپنے کمرے میں گئے اور الماری کھلنے کی آواز آئی، جس سے اس آدمی کی باچھیں کھل گئیں اور اس کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ غالباً وہ پہلے سے بھی الماری کھلنے کی آواز سے واقف تھا۔ جب پروفیسر محمد مصلح الدّین کمرے سے واپس آئے تو بند مٹھی اس کی طرف بڑھائی جسے اس نے برق رفتاری سے اپنی مٹھی میں بند کر لیا اور پانچ منٹ کے بعد فرشی سلام کرتا ہوا چلا گیا۔ جب وہ چلا گیا تو میں نے پروفیسر محمد مصلح الدّین سے کہا کہ یہ آدمی ٹھگ ہے۔ اس نے اپنا الو سیدھا کر لیا۔ اتنے پیسے میں تو کسی نئے ادارے کا قیام عمل میں آسکتا ہے۔ لیکن پروفیسر محمد مصلح الدّین نے مجھ سے رازداری سے کہا کہ میں جانتا ہوں یہ آدمی حاجت مند ہے لہٰذا اس پیسے سے اس کی مدد ہو جائے گی۔ اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گئے تب میں نے جانا کہ ان کی بیوقوفی میں دوسروں کی امداد کا راز پنہاں ہے۔ انہیں بیوقوف سمجھنے والا خود احمق ہے۔

پروفیسر محمد مصلح الدّین طبعاً خاک نشیں ہیں۔ ان کی ذات میں تصنع اور ریا کاری نہیں، گھمنڈ اور خود نمائی سے پرہیز کرتے ہیں۔ ان کے دل میں جو ہے وہی ان کی زبان سے نکلتا ہے۔ لوگ رؤسا کی محفلوں میں شریک ہو کر دلی مسرّت محسوس کرتے ہیں لیکن پروفیسر محمد مصلح الدّین غریبوں اور مفلسوں کے یہاں حاضر ہو کر خوشی اور سکون کا اظہار کرتے ہیں۔ میں نے انہیں بارہا دیکھا ہے کہ وہ اپنی حیثیت سے کم اشخاص کے یہاں تقریب میں حاضر ہو کر خاک نشینی کا ثبوت دیا ہے۔ حاجت مندوں، ناداروں اور غریبوں کی امداد کا جذبہ انہیں میسّر ہے۔

پروفیسر محمد مصلح الدّین سیاست کے بھی مردِ میدان ہیں اور اس میں سرگرم حصّہ لیا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب یہ سیاسی شخصیات کے قریب تھے اور سیاسی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتے تھے لیکن کبھی اپنے ضمیر کا سودا نہیں کیا اور نہ کبھی اربابِ سیاست کی جبہ سائی کی اور نہ کسی کی خوشامد کے مرتکب ہوئے۔ حاشیہ برداری، خوشامد ان کا شیوہ نہیں۔ انہوں نے دوسرے لوگوں کی مدد کی لیکن کبھی اپنا مفاد حاصل نہیں کیا اور نہ کبھی سیاست کو اپنے نام و نمود کا ذریعہ بنایا۔

پروفیسر محمد مصلح الدّین نے جب اپنی تعلیم مکمل کر لی تو جناب گپتیشور پرساد سنگھ مرحوم (سابق چیرمین انٹر کاؤنسل) نے ان کی حوصلہ افزائی کی اور بی ایس کالج داناپور کے شعبہ ٔ اُردو کی عارضی ذمہ داری سونپی لیکن کچھ ہی دنوں کے بعد بہار یونیورسٹی سروس کمیشن سے مستقل لکچرر مقرر ہو گئے۔ گپتیشور بابو جب بی ایس کالج میں تھے اس وقت انہوں نے پروفیسر محمد مصلح الدّین کا ہر طرح سے خیال رکھا۔ جب وہ پرنسپل ہو کر اے این کالج آ گئے تو یہاں کے شعبہ ٔ اُردو میں پی جی پڑھائی کا نظم کیا اور یونیورسٹی سے منظوری ملے کر پروفیسر محمد مصلح الدّین کو پی جی شعبہ ٔ اُردو اے این کالج میں بلا لیا اور شعبہ کی ہمہ جہت ترقی کی ذمہ داریاں انہیں سونپ دیں۔ شعبہ کے تعلیمی و تدریسی مشاغل اور کاموں کی فراوانی کی وجہ سے اس زمانہ میں ان کا رشتہ سیاست سے ٹوٹ گیا۔ ان کے زمانے میں پی جی شعبہ ٔ اُردو اے این کالج میں ہمہ جہت ترقی ہوئی۔ یہاں پٹنہ کے طالب علموں کے علاوہ بہار شریف، باڑھ، پٹنہ سیٹی، جہان آباد اور شاہ آباد کے طالب علم داخلہ لیا کرتے تھے اور ۸۰ طالب علموں کی تعداد تھی۔ اس شعبہ میں پروفیسر محمد مصلح الدّین نے درس و تدریس کے ساتھ ساتھ علمی و ادبی اعتبار سے شعبہ کی ترقی میں نمایاں کردار ادا کیا اور سیمینار و مشاعرہ کا انعقاد کیا اور 'قومی یکجہتی اور اُردو ادب' کے موضوع پر ایک یادگار سیمینار و مشاعرہ کرایا جس کی صدارت پروفیسر وہاب اشرفی نے کی تھی اور پروفیسر محمد مصلح الدّین کی گذارش پر مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے اُردو کے شہرت یافتہ افسانہ نگار جناب جوگیندر پال نے شرکت کی تھی۔ یہ سیمینار اپنی نوعیت کے اعتبار سے اہم اور شاندار تھا جس میں جناب عبدالمغنی، طلحہٰ رضوی برق، قمر آعظم ہاشمی، صابر آروی اور حفیظ بنارسی وغیرہ شریک ہوئے تھے۔ ادبی حلقوں میں اس کی خوب پذیرائی ہوئی تھی۔ پروفیسر محمد مصلح الدّین نے شعبہ کے تعلیمی و تدریسی اور ادبی کاموں میں حصہ لینے کے علاوہ شعبہ کے طلبا و طالبات کے لئے کتابوں کا ایک قیمتی ذخیرہ بھی اکٹھا کیا اور بہترین لائبریری قائم کرنے میں اپنا بھرپور تعاون دیا جس سے تعلیمی و تدریسی ماحول قائم ہوا اور شعبہ ٔ اردو اپنا مقام بنانے میں کامیاب ہوا۔ لیکن اس درمیان ان کا تبادلہ ہو گیا۔

حیف در چشم زدن صحبتِ یار آخر شد   روئے گل سیر نہ دیدم ما بہار آخر شد

ان کے تبادلے کے بعد شعبہ کو کسی کی نظر لگ گئی جس سے طلبا کا ناقابلِ تلافی نقصان ہوا۔

اگر ادبی اعتبار سے پروفیسر محمد مصلح الدّین کی خدمات کا جائزہ لیا جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے کثرت سے مضامین و مقالات سپردِ قلم کئے ہیں۔ ان کے ادبی رویئے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ادب کو نام و نمود اور شہرت کا ذریعہ نہیں سمجھتے بلکہ ادب کی خاموش خدمت کرنے میں یقین رکھتے ہیں۔ انہوں نے نئے لکھنے والوں کی بھی بھرپور حوصلہ افزائی کی ہے جس کی وجہ سے نئے لکھنے والے ان کے خلوص کے معترف ہیں۔ یہ جس کالج یا ادارہ میں رہے ان کی حلقہ بگوشی میں لوگوں نے فخر محسوس کیا۔ شروع میں انہوں نے افسانے لکھے ان کا پہلا افسانہ 'گلاب کا لہو' ۱۹۷۲ء میں 'بیسویں صدی' دہلی میں پہلی بار شائع ہوا جسے ادبی حلقوں میں سراہا گیا۔ ان کا دوسرا افسانہ 'تعبیر' ۱۹۷۳ء میں 'پرچم ہند' دہلی میں منظر عام پر آیا اس کے بعد کئی مقالات و مضامین شائع ہوئے۔ اب تک ان کی تین کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ اور دو کتابوں کا مسودہ تیار ہے لیکن بعض وجوہات سے التوا میں ہے۔ انہوں نے اکثر آل انڈیا ریڈیو اور دوردرشن کے ذریعہ بھی اپنے فکر و احساس کا جادو جگایا ہے۔

پروفیسر محمد مصلح الدّین کی پہلی کتاب 'اُردو شاعری اور نثر کی ارتقائی منزلیں' ۱۹۸۸ء میں شائع ہوئی جس میں انہوں نے پہلے باب میں اُردو شاعری کے ارتقاء کا مختصر جائزہ لیا ہے اور سماجی و سیاسی اور معاشرتی و ادبی پس منظر میں اُردو شاعری کا مطالعہ پیش کیا ہے۔ انہوں نے مختلف تحریکات کے علاوہ اُردو شاعروں کی کوششوں پر بھی ناقدانہ اظہارِ خیال کیا ہے اور جن وجوہات سے اُردو شاعری کی ترقی کی راہیں مسدود ہو گئیں اور امکانات دھندھلے ہو گئے اس پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اور اس کے ساتھ اس کی خوبیوں اور خصوصیات پر اپنے فکر و احساس کا اظہار کیا ہے۔ انہوں نے موجودہ شعراء کو زندگی کے جدید مطالبات اور عصری تقاضوں سے بھی واقف کرایا ہے اور موجودہ حالات کے تقاضوں سے شاعری کو ہم آہنگ کرنے کا مشورہ دیا ہے جس سے ان کے فکر و خیال کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

اس کتاب کے دوسرے باب میں اُردو نثر کے عہد بہ عہد ارتقاء کا جائزہ لیا گیا

ہے اور نثر کے ارتقاء کا ایک صاف اور واضح نقش اُبھارنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اُردو نثر کی ترقی میں جن تحریکات ومحرکات اور ادیبوں وانشاء پردازوں نے حصّہ لیا اس کی بھی انہوں نے ناقدانہ وضاحت کی ہے اور نثر کی مختلف صنفوں نے اس کی ترقی میں جو حصّہ لیا اس کا بھی تفصیلی ذکر کیا گیا ہے اور قدیم وجدید نثر کے تصادم میں جس نثر نے نئے روپ دھارے اور نثر کے ارتقاء میں حصّہ لیا اس پر بھی اس باب میں اظہار خیال کیا گیا ہے اور اُردو نثر کی مزید ترقی کے امکانات کی وضاحت کر کے ادیبوں اور انشا پردازوں کو مشورہ دیا گیا ہے کہ وہ اپنی تخلیقی قوت سے مصرف لے کر اس کی ترقی میں اہم رول ادا کریں۔

پروفیسر محمد مصلح الدّین کی دوسری کتاب 'نشور کی غزل گوئی' ۱۹۹۰ء میں منظر عام پر آئی۔ اس کتاب میں انہوں نے نشور کی شاعرانہ خصوصیات اور ان کی شاعری کا جائزہ تاریخی، سماجی وسیاسی اور ادبی پس منظر میں لیا ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے خصوصاً نشور کی غزلوں پر اظہار خیال کیا ہے اور ان کی غزلوں کا ناقدانہ جائزہ لے کر اُردو شاعری میں ان کے مقام ومرتبہ کا تعین کیا ہے۔ گرچہ نشور نے منظومات، مثنویات، قطعات اور رباعیات میں مقبولیت حاصل کی لیکن بقول پروفیسر محمد مصلح الدّین کہ نشور کی مقبولیت کا اصل سبب ان کی غزلیں ہیں۔

پروفیسر محمد مصلح الدّین کی تیسری کتاب 'شناخت' ہے جو ۱۹۹۷ء میں منظر عام پر آئی۔ دراصل یہ ان کے تنقیدی مضامین ومقالات کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً لکھا گیا ہے۔ اس کتاب میں تیرہ مضامین شامل ہیں جو ان کی ناقدانہ بصیرت کے شاہد ہیں۔ اس کتاب کا پہلا مقالہ 'ادب کا کام اور ادیب کے فرائض' ہے۔ جس میں ادب کا کام اور ادیب کے فرائض سے بحث کی گئی ہے اور اس کی اہمیت وافادیت سے روشناس کرایا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ ادب ہمارے معاشرہ کے ذہن اور عقل وشعور کی تعمیر وتشکیل میں اہم حصّہ لیتا ہے اور ہماری زندگی کو حسن وجمال سے آشنا کر کے ہماری مادی وروحانی دنیا کو حسین اور رنگین بناتا ہے۔ انہوں نے اس مقالہ میں ادیبوں اور شاعروں سے یہ توقع کی ہے کہ وہ ادب میں بے خوف وخطر ہر قسم کے سوالات اٹھائیں اور ظلم وناانصافی کے خلاف بات کہنے کا خوف دل سے نکال کر اپنی تخلیقی بے باکی سے مصرف لیں۔ اس کتاب کا دوسرا مقالہ

'معروضات غزل' ہے جس میں غزل کی خوبیوں کی طرف واضح اشارہ کیا گیا ہے اور خرابیوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اس کے بعد مشہور و معروف ناقد کلیم الدین احمد کی تنقید نگاری کا جائزہ لیا گیا ہے اور ان کی تنقیدی خوبیوں سے بحث کی گئی ہے۔ مقالہ 'شادؔ کا رنگ سخن' میں پروفیسر محمد مصلح الدّین نے شادؔ کے شاعرانہ محاسن سے بحث کی ہے اور تجزیہ و تنقید کے علاوہ شادؔ کے رنگ سخن کا دوسرے شعراء سے مقابلہ کیا ہے جس سے ان کے تجزیاتی مقابلہ و موازنہ کی صلاحیت کا بخوبی اندازہ لگ جاتا ہے۔ اس کے علاوہ داغؔ کی شاعری کا پس منظر، طلحہؔ رضوی برقؔ کی غزل گوئی اور 'طلسم سفر پر ایک نظر' وغیرہ پر پروفیسر محمد مصلح الدّین نے اپنے فکر و خیال کا اظہار کیا ہے۔

پروفیسر محمد مصلح الدّین نے بیسویں صدی کی آخری دہائی اور اکیسویں صدی کی پہلی دہائی میں لگ بھگ پچاس مضامین و مقالات لکھے جو وقتاً فوقتاً شائع ہوئے۔ مثلاً 'سودا کا سماجی شعور'، 'میرؔ کا سماجی شعور'، بہادر شاہ ظفرؔ کا المیہ'، 'فیضؔ کی شاعرانہ خصوصیات'، 'مخدوم کی شاعرانی جبلت'، 'جمیلؔ مظہری کی رومانی و سیاسی نظمیں، بہار کے چند انشائیہ نگار'، احمد ندیم قاسمیؔ اور صحافت' اور 'اختر اورینوی' وغیرہ ادبی اعتبار سے اہم اور قیمتی مقالے ہیں۔

پروفیسر محمد مصلح الدّین کی کتابوں اور مقالات و مضامین کے تناظر میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے فکر و خیال اور نقد و نظر کے اعتبار سے سلجھے ہوئے ادیب و دانشور ہیں۔ زبان و بیان پر گرفت کے علاوہ ان کا انداز و اسلوب جاندار اور اہمیت کا حاصل ہے اور وہ لگاتار ادبی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ انہیں 'نہ ستائش کی تمنا ہے نہ صلے کی پروا'

□□

پروفیسر محمد یونس حسین حکیم

پروفیسر محمد یونس حسین حکیم کے والد سخاوت علی خاں مرحوم کا تعلق رام پور ضلع دربھنگہ سے تھا۔ آپ کو مالک حقیقی نے سات بیٹوں اور بیٹیوں سے نوازہ تھا۔ ۲۲ / جولائی ۱۹۴۳ء میں خاں صاحب کے گھر چوتھا چشم چراغ روشن ہوا جس کا نام محمد یونس حسین حکیم رکھا گیا۔ اس بچہ کی ابتدائی تعلیم دربھنگہ میں ہوئی آگے چل کر زولوجی سبجکیٹ سے ایم ایس سی کیا اس کے بعد ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ حکیم صاحب کو پڑھنے اور پڑھانے کا شوق جنون کی حد تک ہے۔ یکم دسمبر ۱۹۶۴ء کو سمستی پور کالج، سمستی پور کے شعبہ زولوجی سے وابستہ ہوئے۔ اس کے بعد انہوں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا اور لگاتار ترقی کے زینے طے کرتے رہے۔ حکیم صاحب نے جہاں صدر شعبہ زولوجی کے عہدے کی شان بڑھائی وہیں ڈین فیکلٹی آف سائنس للت نرائن متھلا یونیورسٹی کے عہدے کو بھی وقار بخشا۔ حکیم صاحب کے پاس ڈگریاں آسمان پر بکھرے تاروں کی مانند ہیں۔ ان کا دل جہاں تعلیم کی حصولیابی میں سرگرداں رہتا ہے وہیں دوسروں کو تعلیم یافتہ بنانے کے لئے بھی فکرمند رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کئی اسکالران کی نگرانی میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری سے سرفراز ہو چکے ہیں۔ موصوف کی نظر کو یہ شرف حاصل ہے کہ وہ جہاں زمین کی سطح کے اوپر دیکھتی ہے وہاں زمین کی سطح کے نیچے بھی دیکھ لیتی ہے۔ پانی کی افادیت سے انکار ممکن نہیں۔ چنانچہ واٹر

پولوشن پر موصوف کے تین سے زائد تحقیقی نوعیت کے مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ جن کی بدولت وہ سائنسدانوں میں بھی سرفراز ہیں۔ رنگ پختہ چہرہ داڑھی سے مزین، جو پہلے بھی سیاہ تھی اور اب بھی سیاہ ہے۔ سفیدی ترس گئی ان کی داڑھی پر براجمان ہونے کے لئے۔ صبح کی چہل قدمی کے شیدائی ہیں۔ موسم گرمی کا ہو یا سردی کا ان کے اس معمول میں خلل نہیں ڈال سکتا۔ غالباً یہی سبب ہے کہ بڑھاپا ابھی تک ان کے جسم کو چھو نہیں سکا ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ عمر کی اس منزل پر بھی ان کے جوش و خروش میں ذرا بھی کمی نہیں آئی ہے۔ ۲۷ر نومبر ۱۹۸۴ء بہار اسٹیٹ مدرسہ ایجوکیشن بورڈ کے چیرمین بنے اور دو ٹرم اس عہدہ پر فائز رہے۔ ان دنوں ان کا مسکن محلہ رکن پورہ تھا۔ اس علاقے میں مکانات ضرور تھے مگر دور دور پر واقع تھے۔ چاروں طرف کھیت ہی کھیت جہاں باضابطہ کھیتی کی جاتی تھی۔ جس جگہ دن میں وحشت کا احساس ہو وہاں رات میں وحشت کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ اس کے باوجود حکیم صاحب جب تک چیرمین رہے اسی مکان کے مکین رہے۔ اس سنسان اور غیر آباد جگہ میں رہنا اسی شخص کے لئے ممکن ہے جس کا دل ایمان کی قوت سے سرشار اور جنگل میں منگل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ حکیم صاحب پُرکشش شخصیت کے مالک ہیں۔ ان سے جو شخص ایک بار ملا ان کا گرویدہ ہو گیا۔ ان کی گفتگو کا انداز نہایت دل چسپ ہوتا ہے اگر آپ ان کے پاس بیٹھ جائیں تو پھر اٹھنے کی طبیعت نہیں کرے گی۔ وقت کیسے گزر گیا آپ کو اس کا مطلق احساس نہیں ہوگا۔ مدرسہ کے امتحان کے دنوں میں ان کی رہائش گاہ کے باہر کھلنے والے کمرے دفتر میں بدل جاتے تھے، جہاں مدرسہ بورڈ کے جوان ملازمین کی ڈیوٹی لگتی تھی۔ اس زمانے میں میں نے بارہا دیکھا کہ حکیم صاحب ان ملازمین کو بیٹا کہہ کر مخاطب کیا کرتے تھے۔ جس شخص کے طرز عمل سے دوسروں میں اپنائیت کا احساس ہو اس کے گھر پر عوام اور خواص کا ہجوم بے سبب نہیں۔ میں جب بھی ان کی رہائش گاہ پر گیا انہیں لوگوں کے ہجوم میں گھرا پایا۔ وہ سبھوں کی سنتے تھے لیکن ان کے ماتھے پر بل نہیں پڑتا تھا۔ میں نے بارہا دیکھا کہ حکیم صاحب دفتر جانے کی تیاری کر رہے

ہیں پھر بھی لوگ اپنی پپتا سنا رہے ہیں۔ سننے والا سن رہا ہے جواب دے رہا ہے ساتھ ساتھ کپڑے بدل رہا ہے۔ حکیم صاحب جہاں کھانے کے شائق ہیں وہاں دوسروں کی ضیافت کا بھی حد درجہ شوق رکھتے ہیں۔ میں نے ان کے یہاں دسترخوان پر مرغ و ماہی اور انواع اقسام کے سالن کو ایک ساتھ دیکھا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ انہوں نے مرغ و ماہی کو زبان محاورہ سے نکال کر دسترخوان پر ایک ساتھ موجود رہنے کا حکم دے رکھا ہے۔ ان کے دسترخوان پر سبزیوں کی بھی الگ فوج رہتی ہے۔ انہیں میٹھی چیز سے خاص رغبت ہے۔ ناشتہ کا وقت ہوا دسترخوان لگ گیا اور حکیم صاحب نے ملنے والوں کو بھی بیٹھا لیا۔ اگر کسی نے پیٹ بھرا ہونے کی بات کی تو حکیم صاحب صرف ایک لقمہ لیجئے، تھوڑا میٹھا ہی لے لیجئے کی التجا کرتے نظر آئے۔ غرض کہ حکیم صاحب کے دسترخوان سے بغیر کچھ کھائے گلو خلاصی ممکن نہیں۔ راقم الحروف کو بھی کئی بار حکیم صاحب کے ساتھ کھانے کا شرف حاصل ہو چکا ہے۔ ایک صبح جب دسترخوان لگا تھا بلا مبالغہ مرغ و ماہی سبزی، پراٹھا پوا اور کچوڑیوں سے دسترخوان پٹا پڑا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا کہ کسی خاص مہمان کو حکیم صاحب نے مدعو کیا ہوگا تبھی اس قدر اہتمام ہے۔ مگر یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ دسترخوان پر وہی لوگ شامل ہوئے جو اپنے اپنے کام سے آئے تھے۔ حکیم صاحب مجھ سے پوا کو سالن کے ساتھ کھانے کو کہا تب میں پس و پیش میں پڑ گیا کہ میٹھا اور نمکین ایک ساتھ کیسا لگے گا۔ ان کا اصرار بڑھا اور میں نے سر تسلیم خم کر دیا۔ آج بھی مجھے اس ذائقے کی یاد آتی رہتی ہے۔ زبیدہ حکیم کے ہاتھوں سے بنے کھانے کی ایک خاص لذت ہوا کرتی تھی، جسے فراموش کرنا ممکن نہیں۔ ان کے دست خاص سے بنی چوڑے کی کھیر کا ذائقہ ہنوز یاد ہے۔ حکیم صاحب کے یہاں نوکر دائی کی ایک لمبی فوج رہتی تھی مگر اس کے باوجود وہ کام خود سے کیا کرتی تھیں۔ وہ ایک نیک دل اور متقی خاتون تھیں۔ ۱۱ اگست ۱۹۹۷ء کو مالک حقیقی نے انہیں اپنے پاس بلا لیا۔

حکیم صاحب کی یادداشت غضب کی ہے۔ مدارس کے نام، پرنسپل کے نام،

کمیٹی کے ممبران کے نام انہیں ازبر تھے۔ بارہا میں نے دیکھا کہ مدرس حضرات ابھی اپنی کمیٹی کے ممبر کا نام سوچ ہی رہے تھے کہ حکیم صاحب نے ان کا نام بتا دیا اور کہا آگے کہیئے۔ حکیم صاحب کی اس کیفیت کو دیکھ کر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ایک ماہر عامل کو اپنی تسبیح کے دانوں سے کھٹ کھٹ کی آواز نکالنے میں دیر ہو سکتی ہے مگر حکیم صاحب کو نام بتانے میں مطلق دیر نہیں ہو سکتی۔ حکیم صاحب کی ذات سخاوت اور فیاضی کا سر چشمہ ہے۔ کون کس غرض سے حاضر ہوا ہے بتانے سے قبل ہی جان جاتے۔ موسم برسات میں شمع کے گرد پروانے جس طرح طواف کرتے ہیں اسی طرح حکیم صاحب کا مدرسہ کے امتحان اور کاپیوں کی جانچ کے وقت لوگ طواف کرتے تھے۔ کوئی دل میں آبزرور بننے کی خواہش دبائے چلا آرہا ہے، کسی کے دل میں کاڈینیٹر کی تمنا مچل رہی ہے، کوئی ہیڈ اکزامنر بننے کے لئے بے قرار ہے، کچھ ممتحن بننے کے لئے سرگرداں ہیں۔ الغرض جس طرح کسی حکیم کے مطب میں مریض اپنے مرض سے چھٹکارہ حاصل کرتا ہے اسی طرح حکیم صاحب بھی سبھوں کی مشکلوں کو آسان کرتے تھے۔ حکیم صاحب جب تک چیرمین رہے راقم الحروف بھی آبزرور اور کاڈینیٹر بنتا رہا۔ ادھر امتحان کی کاپیوں کی جانچ کی تاریخ مقرر نہیں ہوئی کہ میں اپنی اسامی پکی کرانے کی غرض سے حکیم صاحب کے دربار میں حاضر ہو گیا۔ علیک سلیک کے بعد انہوں نے کہا کہ ملتے رہیں ابھی Evaluation کی تاریخ مقرر نہیں ہوئی ہے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ ابھی میں نے مدعا بھی بیان نہیں کیا مگر سمجھنے والا سمجھ گیا۔ چند ہفتوں کے بعد جب میں دوبارہ ان کی رہائش گاہ پر گیا تو معلوم ہوا کہ چیرمین صاحب گھر پر نہیں ہیں۔ میں مایوسی کی حالت میں واپس روڈ پر آگیا اور داناپور سے آنے والے آٹو کی طرف مسلسل دیکھ رہا تھا، کافی دیر ہو گئی مگر کوئی خالی آٹو نہیں آیا۔ اسی درمیان کسی کے پکارنے کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی، مڑ کر دیکھا تو ایک شخص مجھے بلا رہا تھا۔ کھیت پار کر کے اس کے قریب پہنچا تو اس نے کہا ''چیرمین صاحب بلا رہے ہیں۔ یہ کہہ کر اس نے اطمینان کی سانس لی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ میں روڈ پر کھڑا تھا مگر چیرمین صاحب کی گاڑی کو

آتے ہوئے کیونکر نہیں دیکھ سکا۔ بہر کیف حکیم صاحب کے قریب پہنچا، انہوں نے مجھے دیکھتے ہی برجستہ کہا کہ ''آپ کہاں رہ گئے میں نے تو ملتے رہنے کو کہا تھا۔ آج ہی سے Evaluation شروع ہے۔ خط لکھ دیتا ہوں چھپرہ سینٹر کے لئے روانہ ہوجائے۔'' اس واقعہ سے بخوبی علم ہوجاتا ہے کہ حکیم صاحب کس قدر چہرہ یاد رکھتے تھے۔ میری نظر دانا پور سے آنے والے آٹو کی طرف تھی۔ چیرمین صاحب کی گاڑی سمن پورہ کی طرف سے آئی۔ میں ان کو دیکھ نہ سکا مگر انہوں نے مجھے روڈ پر کھڑا دیکھ لیا۔ کوئی دوسرا ہوتا تو دل ہی دل میں کہتا کہ چلو بلا ٹلی۔ حکیم صاحب ۳۱ رجولائی ۲۰۰۳ء میں للت نرائن متھلا یونیورسیٹی کی ملازمت سے سبکدوش ہوگئے۔ مگران کے مشاغل میں کوئی فرق نہیں آیا خواہ لکھنے پڑھنے کا شوق ہو یا علم کی جوت جگانے کا ذوق، مقدم الذکر شوق کی بدولت انہوں نے اسلام اور مسلمان کے عنوان سے ایک اہم اور معلوماتی کتاب رقم کی ہے جس کی پہلی جلد زیور طبع سے آراستہ ہوچکی ہے۔ اس کتاب پر مصنف کو مولانا آزاد سا

ہتہ اکادمی دہلی نے انعام واعزاز سے نوازہ ہے۔ اس کتاب کی باقی جلدیں کتابت کے مرحلے میں ہیں۔ مذکورہ کتاب سے پہلے حکیم صاحب کی ایک اور کتاب بہ عنوان 'بائیلوجی پریکٹیکل' منظر عام پر آچکی ہے۔ جو دو جلدوں پر مشتمل ہے اور آئی ایس سی کے نصاب میں شامل بھی ہے۔ موخر الذکر شوق ہی کی یہ کارفرمائی ہے کہ انہوں نے سمستی پور میں السخاوت ایجوکیشن کمیٹی کی داغ بیل ڈالی۔ جس کے تحت گیرن لینڈ انگلش میڈیم اسکول چلتا ہے۔ حکیم صاحب نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ''زبیدہ حکیم دینی مرکز'' بھی قائم کیا۔ جہاں غریب اور معذور بچوں کو مفت تعلیم دی جاتی ہے اس مرکز کے اخراجات حکیم صاحب اپنے جیب خاص سے کرتے ہیں۔ مذکورہ دونوں اداروں کے حکیم صاحب خود چیر مین ہیں۔ اس کے علاوہ وہ مختلف تنظیموں کے ممبر بھی ہیں جس کی تفصیل کچھ اس طرح ہے۔

(ا) چیف کنسلٹ کم پروجکٹ کاڈینیٹر نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اوپن اسکول نئی دہلی (اس ادارے کے تحت حکیم صاحب بہار کے انچارج ہیں جن کے ذمے اسکول بالخصوص

مدارس میں ووکیشنل تعلیم کا نظم کرنا ہے)

(۲) ممبر بہار انٹرمیڈیٹ ایجوکیشن کاونسل

(۳) ممبر آل انڈیا سائنس کانگریس ایسوسی ایشن

(۴) ممبر نیشنل اکادمی آف سائنسز

(۵) ممبر انڈین انوائرمنٹ کانگریس

(۶) ممبر انڈین ایسوسی ایشن آف واٹر پولوشن کنٹرول

(۷) ممبر ریسرچ فیلڈ آف انوائر پولوشن

آج کا مسلمان مسلک کے خیمے میں بٹا ہوا ہے۔ حالات کی ابتری کا عالم یہ ہے کہ پہلے وہ مسلکی ہے پھر مسلمان ہے۔ حکیم صاحب کی ذات مقدس مسلکی لعنت سے پاک ہے۔ ایک صاحب نے جب ان کا مسلک جاننا چاہا تو حکیم صاحب نے برجستہ کہا کہ ''وہ محمدی مسلک کے ماننے والے ہیں۔''

□□

پروفیسر محمد شفاعت

سیتل پور قصبہ فتح پور بلاک گیا میں واقع ہے۔ جہاں الٰہی بخش کے گھر میں ۱۱؍ جولائی ۱۹۴۶ء کو ایک بچے نے جنم لیا، جس کا نام انہوں نے محمد شفاعت رکھا۔ اس شیر خوار بچہ نے جب اپنے پیروں پر چلنا شروع کیا تو اس کی تعلیم و تربیت کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ فتح پور ہائی اسکول سے میٹرک کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کرنے کے بعد شفاعت صاحب نے ۱۹۶۳ء میں سائنس کالج میں داخلہ لیا جہاں اعلیٰ تعلیم کی حصولیابی کا سلسلہ شروع ہوا۔ ۱۹۷۰ء میں انہیں پٹنہ یونیورسٹی نے ایم ایس سی کی ڈگری سے سرفراز کیا۔

یوں تو لڑکپن کا زمانہ بے فکری کا ہوتا ہے، جہاں جوانی کی ترنگ میں دوسروں کے دکھ درد کوئی معنی نہیں رکھتے مگر اس کے برخلاف محمد شفاعت بچپن ہی سے دوسروں کے دکھ درد سے نہ صرف متاثر ہوتے تھے بلکہ اس کے ازالے کے لئے کوشاں بھی رہتے تھے۔ اس ضمن میں یہاں دو واقعے تحریر کئے جاتے ہیں۔

سیتل پور قصبہ میں کچھ گھرانے ایسے تھے جن کے بچوں کی تعلیم کا نظم تھا اور انہیں بچوں سے وہاں کی ناخواندہ خواتین اپنے اپنے خط پڑھواتی تھیں۔ ایک دن محمد شفاعت نے ایک عورت سے اُس کے مغموم ہونے کا سبب دریافت کیا تو وہ بولی ”کیا بتاؤں بوا خط پڑھوانے گئی تھی کہ شریفن بی بی بگڑ گئیں کیا میرا بیٹا تم لوگوں کے خط پڑھنے کے لئے تعلیم حاصل کر رہا ہے؟“ یہ سنتے ہی محمد شفاعت کا حساس دل تڑپ اٹھا اور انہوں نے کہا لاؤ خط

ہم پڑھ دیتے ہیں۔ انہوں نے جب خط پڑھ کر سنایا تو اس عورت کا چہرہ کھل گیا۔ اس کے بعد خط پڑھوانے والیوں کا تانتا لگ گیا۔ ان عورتوں میں کچھ ایسی تھیں جو خط پڑھوانے کے بعد ان سے بولتیں۔ ''بوا تو ہی اپنے من سے جواب لکھ دا۔'' اس وقت شفاعت صاحب کو سخت دماغی کسرت کرنی پڑتی تھی۔ اس کے باوجود وہ خندہ پیشانی سے جواب لکھ دیا کرتے تھے۔ اس وقت ان کی عمر صرف دس سال کی تھی۔

میٹرک کا امتحان امتیازی نمبر سے پاس کرنے کے بعد شفاعت پٹنہ آگئے۔ یہاں ان کا قیام مظہر لاج دریاپور پٹنہ میں ہوا کرتا تھا۔ اکثر یہ دیکھا گیا کہ کالج میں داخلہ لینے کے بعد کچھ طالب علم یکسوئی کے ساتھ تعلیم کی حصولیابی میں لگ جاتے ہیں اور کچھ جلوہ حسن کے چکا چوندھ میں بھٹک جاتے ہیں۔ لیکن شفاعت جہاں تعلیم سے بے بہرہ نہیں ہوئے وہیں دوسروں کی مدد کے جذبے سے غافل بھی نہیں ہوئے۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ ان پر جیوں جیوں سن بلوغیت آتی گئی ویسے ویسے ان کے دل میں دوسروں کی مدد کا جذبہ شدید ہوتا گیا۔ غریب بچیوں کی شادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ بقول شاعر لاکھ آفتیں لے کر حسینوں پر شباب آیا اور یہی شباب جب ایک صاحب کی دختر نیک اختر پر آیا تو واقعی لاکھ آفتیں لے کر آیا۔ چنانچہ سڑک چھاپ مجنوں بھنورے کی طرح دوشیزہ کے گھر کے اردگرد منڈلانے لگے۔ شفاعت صاحب مظہر لاج آتے جاتے یہ تماشا دیکھتے رہتے۔ جب مجنوں کی پریڈ کچھ زیادہ بڑھی تو انہوں نے ایک دن لڑکی کے باپ کو بلوایا اور دریافت کیا کہ تم اپنی بیٹی کی شادی کیوں نہیں کر دیتے۔ یہ سنتے ہی اس نے اپنی مفلوک الحالی کا رونا رونے لگا اور کہا کہ ''جسے پیٹ بھرنے کو کھانا ٹھیک سے میسر نہ ہو وہ اپنی بیٹی کی شادی کرے تو کیسے کرے۔'' اس کے خاموش ہوتے ہی شفاعت صاحب نے کہا کہ ''تم پیسوں کی فکر مت کرو، لڑکا تلاش کرو۔'' چند دنوں کے بعد لڑکی کا باپ شفاعت صاحب کے پاس آیا اور فرمایا کہ ''لڑکا مل گیا ہے، سائیکل اور گھڑی کی فرمائش ہے۔ پیسوں کا نظم ہو جائے تو بات پکی کر دوں۔'' شفاعت صاحب نے جب اسے شادی کی تاریخ مقرر کرنے کو کہا تو وہ خوشی خوشی سے چلا گیا۔ دوسرے دن شفاعت صاحب نے اپنے لفٹیننٹ کی میٹنگ بلوائی جس میں محبوب عالم معین اور شفاعت صاحب نے شرکت کی،

چند دنوں کے اندر مطلوبہ رقم اکٹھی ہوگئی اور شادی بخیر خوبی انجام پا گئی۔

شفاعت صاحب نام و نمود یا دِکھاوے کی خاطر کسی کی مدد نہیں کرتے بلکہ ان کے دل میں انسانیت کی خدمت کا جذبہ پیدائشی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جہاں بھی رہے اشرف المخلوقات کی خدمت سے غافل نہیں ہوئے۔

بھاگلپور میں شفاعت صاحب کا قیام محلہ بھیکن پور میں تھا۔ وہ اکثر نبی بخش سے ملنے مجاہد پور جایا کرتے تھے۔ حسب معمول ایک دن نبی بخش کے گھر گئے۔ دوران گفتگو انہوں نے متلی کی آواز سنی۔ جب نبی بخش کی توجہ اس آواز پر مبذول کرائی تو وہ بے رخی سے بولے، ''کل سے بڑھیا متلی کر رہی ہے۔'' یہ سنتے ہی شفاعت صاحب نبی بخش کی بیگم کو دیکھنے اس کے کمرے میں چلے گئے۔ کمرے کا بیشتر حصّہ متلی سے گندا ہو چکا تھا۔ اس کے باوجود وہ مریضہ کے پلنگ پر بیٹھے اور مزاج پرسی کی۔ اس کے بعد وہ ڈاکٹر بلانے تاتارپور چلے گئے۔ جہاں وسیع و عریض خطہ اراضی پر ایک مشہور ڈاکٹر کی کوٹھی تھی۔ شفاعت صاحب دیوانہ وار صدائیں لگاتے رہے مگر گیٹ نہیں کھلا۔ رمضان کا مہینہ اور شب کے گیارہ بج چکے تھے۔ بوجھل قدموں سے مجاہد پور لوٹے۔ اور نبی بخش کی بیگم کو رکشے پر لاد کر اسپتال لے گئے۔ جہاں مریضہ کو بھرتی کرنے کے بعد پانی چڑھانے کا عمل شروع ہوا۔ اس سے فارغ ہو کر رات کے ایک بجے جب اپنے کمرے میں پہونچے تو ان کو دیکھتے ہی ان کا روم پارٹنر برس پڑا۔ جب شفاعت صاحب نے دیر سے آنے کا سبب بتلایا تب وہ خاموش ہوا۔ دوسرے دن جب شفاعت صاحب اسپتال پہنچے تو معلوم ہوا کہ بغیر ڈاکٹر کی اجازت کے مریضہ اسپتال سے چلی گئیں۔ اسی دن شام کے وقت مریضہ کی خیریت دریافت کرنے کی غرض سے اس کے گھر گئے۔ وہاں انہوں نے دیکھا کہ دوبارہ متلی کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے۔ یہ کیفیت دیکھتے ہی شفاعت صاحب نے دوبارہ اسپتال میں بھرتی کرایا اور اس کے ساتھ ہی رہے۔ کیونکہ انہیں اس بات کا خدشہ تھا کہ مریضہ مکمل طور سے علاج کرائے بغیر کہیں اسپتال سے دوبارہ بھاگ نہ جائے۔ دوسری طرف مریضہ کے شوہر اپنی بیگم سے صرف اس ڈر سے دور دور رہے کہ کہیں انہیں بھی بیگم کا مرض لاحق نہ ہو جائے۔

ایک عورت اپنے شوہر کے گزر جانے کے بعد دانے دانے کو محتاج ہو گئی اور گھر گھر مانگنا اس کا مقدر بن گیا۔ وہ مانگنے کی غرض سے ایک صاحب کے گھر پر گئی اور اپنی مصیبت کا واسطہ دے کر امداد کی درخواست کی۔ انہیں جو دینا تھا وہ دے دیا اور یہ تاکید بھی کر دی کہ شفاعت صاحب سے مل لو۔ وہ تمہاری بہتری کا راستہ ضرور نکال دیں گے۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ وہ عورت شفاعت صاحب سے ملی اور انہیں اپنی بپتا سنائی۔ شفاعت صاحب نے اس کی مالی اعانت تو کی ہی ساتھ ساتھ امارت اہل انصار کے دفتر سے ایک عدد سلائی مشین بھی دلوا دی تا کہ وہ اپنے پیروں پر کھڑی ہو سکے اور ہر کس و ناکس کے آگے ہاتھ پھیلانے سے بچ سکے۔ شفاعت صاحب نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس کی بیٹی کا داخلہ مدرسہ اصلاح البنات میں کروا دیا اور کتابیں بھی خرید دیں تا کہ علم کی شمع سے وہ اپنے مستقبل کو روشن کر سکے۔ جب ذکر تعلیم کا چھڑا تو محمد اسرائیل ولد محمد جہانگیر کی تعلیم بھی شفاعت صاحب کی مرہون منت ہے۔ ان ہی کی مدد سے وہ ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کر سکا اور اپنے بلاک فتح پور کا پہلا ڈاکٹر بنا۔

شفاعت صاحب ایک سلف میڈ آدمی ہیں۔ وہ آج جس مقام پر ہیں اس میں ان کی محنت اور لگن کو بڑا دخل ہے۔ وہ بچپن سے ہی ایک غیرت مند طبیعت کے مالک ہیں۔ ان کی غیرت مندی کا یہ عالم ہے کہ انہوں نے کبھی اپنے والد ماجد کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا۔ میٹرک سے ایم ایس سی تک انہوں نے ٹیوشن پڑھا کر اپنی کفالت کی۔ انہوں نے جہاں اپنے سے نیچے کے کلاس والوں کو پڑھایا وہیں ان کے ہم جماعت طالب علم بھی مستفیض ہوئے۔ ۱۹۷۱ء میں ان کی تقرری اورینٹل کالج (پٹنہ سیٹی) کے شعبہ کمسٹری میں بحیثیت لکچرار ہوئی تو کالج کے طلبہ میں کیمسٹری پڑھنے کی ہوڑ لگ گئی۔

شفاعت صاحب ۲۸ رجون ۱۹۹۳ء میں بہار کالج سروس کمیشن کے ممبر نامزد ہوئے۔ اس دوران ان کے گھر پر ضرورت مندوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ ٹھیک اسی طرح جیسے خواجہ غریب نواز کے عرس کے دوران اُن کے آستانے پر عقیدت مندوں کا جم غفیر رہتا ہے۔ کسی کو سروس کنفرمیشن کا مسئلہ ہے تو کسی کو پرموشن کا۔ کوئی بحالی کے لئے پیروی کرانا چاہتا ہے۔ غرض کہ ہر طرح کے ضرورت مندان کے گھر کے پھیرے لگاتے ہوئے ملے۔

میں جب بھی ان کے گھر پر گیا کچھ لوگوں کو پہلے سے بیٹھے ہوئے پایا۔ ایک دن کا واقعہ ہے کہ میں ڈاکٹر اسرار حسن خاں کے ہمراہ شفاعت صاحب سے ملنے کے واسطے ان کے گھر پہنچا۔ اتوار کا دن تھا۔ حسب توقع لوگ انہیں گھیرے ہوئے تھے۔ ہم لوگ بھی بیٹھ گئے۔ انہوں نے فرداً فرداً خیریت دریافت کی اور ادھر اُدھر کی گفتگو ہونے لگی اس دوران چائے آگئی اور لانے والے نے سبھوں کے سامنے ایک ایک پیالی رکھدی۔ شفاعت صاحب اندر کے کمرے میں گئے اور ایک منٹ کے بعد دوبارہ ڈرائنگ روم میں لوٹ آئے۔ ان کی انگلیوں میں ٹوتھ برش دبا ہوا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ آپ لوگ چائے پیجئے میں منہ دھو کر حاضر ہوا۔ اس وقت صبح کے ساڑھے نو بجے تھے۔ اس واقعہ کے کئی روز بعد ہم لوگ دوبارہ ان کے یہاں گئے۔ اتفاق سے اتوار کا دن تھا اور لوگوں کا جم گھٹ لگا ہوا تھا۔ علیک سلیک کے بعد گفتگو ہو رہی تھی کہ چائے آگئی۔ شفاعت صاحب کے گھر پر جس وقت پہنچئے چائے حاضر ہے۔ غالباً انہوں نے چائے کو یہ حکم دے رکھا ہے کہ مہمان کے آتے ہی وہ حاضر ہو جائے۔ بہرکیف انہوں نے کہا کہ آپ لوگ چائے پیجئے میں برش کر کے آیا۔ میں نے جب گھڑی دیکھی تو دن کے گیارہ بج چکے تھے۔ ہم لوگ قصداً دیر سے چلے تھے تاکہ انہیں ناشتہ میں خلل نہ ہو۔ مگر جناب والا یہاں تو ایک انار سو بیمار والی کیفیت ہے۔ ناشتہ وقت پر میسّر ہو تو کیسے۔

ایک دن کا واقعہ ہے کہ ایک صاحب شفاعت صاحب کے یہاں آئے۔ اس کے چہرے سے اس کی پریشانیاں صاف جھلک رہی تھیں۔ اس کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ اس کے کالج کی فائل بہار کالج سروس کمیشن میں آئی ہوئی ہے مگر ان کے سکریٹری نے ڈنڈی ماردی ہے۔ وہ مظلوم شخص جب خاموش ہوا تو میں بول پڑا کہ کس طرح کالج کا سکریٹری کسی کے کیریر سے کھلواڑ کرتا ہے اور حق دار کو اس کے حق سے محروم کر دیتا ہے۔ یہ سنتے ہی شفاعت صاحب نے سید مرتضیٰ حیدر کا کہا ہوا ایک واقعہ سنایا۔ پٹنہ یونیوسٹی کے شعبہ عربی میں لکچرار کے خالی جگہ کو پُر کرنے کے لئے اشتہار نکالا گیا۔ انٹرویو کا دن مقرر ہوا۔ صدر شعبہ عربی کے دل میں اپنے کسی رشتہ دار کی بحالی کی خواہش موجزن تھی۔ لہٰذا انہوں نے عربی میں کوئی سوال نہ پوچھ کر اردو میں سوال پوچھنے لگے۔ اس زمانے کا انگریز

پرنسپل بھلا یہ سب کیونکر برداشت کرتا۔ اس نے اُمیدوار کو باہر جانے کا حکم دیا اور صدر شعبہ عربی کی سرزنش کرتے ہوئے انہیں عربی میں سوال پوچھنے کی تاکید کی۔ یہ سنتے ہی صدر شعبہ عربی کا چہرہ حواس باختہ ہوگیا۔ وہ باہر نکلے اور اُمیدوار کے کان میں کچھ کہا۔ اس کے بعد وہ دوبارہ انٹرویو ہال میں آئے اُمیدوار کی طلبی ہوئی اور نئے سرے سے انٹرویو کا سلسلہ شروع ہوا۔

''قل هو الله احد'' صدر شعبہ عربی نے کہا۔

'' اللہ الصمد '' اُمیدوار نے بآواز بلند جواب دیا۔

''لیم یلد ''صدر شعبہ عربی نے کہا۔

''ولیم یولد'' اُمیدوار نے وقت ضائع کئے بغیر بلند آواز میں جواب دیا۔

غرض کہ صدر شعبہ عربی اور اُمیدوار نے پوری آیت پڑھ ڈالی۔ اُمیدوار کو یہ آیت راس آگئی اور وہ لکچرار بنا دیا گیا۔ یہ واقعہ سنتے ہی پوری محفل لالہ زار بن گئی لیکن اگر غور کیا جائے تو عبرت کا مقام ہے کہ کس طرح صاحب اقتدار حقدار کا حق مار کر کسی جاہل کو اعلیٰ منصب پر فائز کر دیتا ہے۔

شفاعت صاحب کی شادی عبدالمغنی مرحوم کی بڑی بیٹی شمیمہ پروین سے ہونا طے پا چکی تھی مگر دن مقرر نہیں ہو پا رہا تھا۔ ان کی ہونے والی خوشدامن صاحبہ کا خیال تھا کہ شادی طمطراق سے ہو، باراتیوں کی فوج ہو، بینڈ باجوں کی پیریڈ ہو، بڑے بڑے گیٹ بنائے جائیں، برقی قمقموں کی روشنی کا سیلاب اُمڈے، کیونکہ ان کے گھر میں پہلی شادی ہے دوسری طرف شفاعت صاحب کے حلق کے نیچے یہ بات اتر ہی نہیں رہی تھی کیونکہ شادی کے نام پر مذکورہ قسم کی فضول خرچی انہیں سخت ناپسند تھی اسی کشمکش کی وجہ سے شادی کی تاریخ طے نہیں ہو پا رہی تھی۔ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ۱۹۷۱ء میں جنگ چھڑ گئی اور سرکار نے دھوم دھام سے تقریب منانے پر پابندی لگا دی۔ شفاعت صاحب کے لئے یہ سنہرا موقع تھا۔ لہٰذا انہوں نے لڑکی والوں پر واضح کر دیا کہ اگر شادی کرنی ہے تو پندرہ دنوں کے اندر ہو جانی چاہئے۔ یہ سنتے ہی ان کی ہونے والی خوشدامن صاحبہ نے سپر ڈال دی۔ شفاعت صاحب چند لوگوں کے ساتھ گئے اور نہایت سادگی سے شادی کی تقریب انجام پا گئی۔ المختصر ان کی شادی ہندو پاک جنگ کی رہین منت ہے۔ ایک طرف فوج اپنے

ملک کی سرحد کی دفاع کر رہی تھی تو دوسری طرف ملک کا شہری فرسودہ رواج اور روایت سے برسر پیکار تھا۔

شفاعت صاحب کو تین اولادیں ہوئیں جن میں دو بچے ہیں خالد اعجاز اور شاہد اعجاز۔ ان کی بچی کا نام شگفتہ ناہید ہے۔ یہ تینوں کالج کی تعلیم سے فارغ ہو چکے ہیں۔

شفاعت صاحب مستورات کا تعلیم یافتہ ہونا ضروری سمجھتے ہیں۔ انہوں نے جہاں اپنی بیٹی کو تعلیم دلوائی وہیں بھانجیوں کی تعلیم پر آنے والے اخراجات کو جیب خاص سے ادا کیا۔ انہوں نے ایک دو نہیں بلکہ پانچ بھانجیوں کو پڑھایا۔

شفاعت صاحب قول کے کس قدر پکے ہیں اس کا اندازہ اس واقعہ سے بخوبی ہو جاتا ہے کہ عبدالمغنی کی علالت نے جب طول پکڑا اور ساری دوائیاں ناکام ہو گئیں حتیٰ کہ مریض کو اپنے چل چلاؤ کا احساس ہو گیا۔ شفاعت صاحب ان کی عیادت کو پہونچے تو عبدالمغنی نے شفاعت صاحب کے ہاتھ کو اپنے ہاتھو میں لیا اور فرمایا، ''بیٹا میری زندگی کا چراغ اب گل ہونے والا ہے لیکن مجھے اپنی چھوٹی بیٹی کی فکر چین سے مرنے نہیں دے رہی ہے۔ میرے بعد اس بچی کا کیا ہوگا۔ اس کی ماں پہلے ہی اللہ کو پیاری ہو چکی ہے۔ یوں تو میرے کئی بیٹے ہیں مگر مجھے ان سبھوں پر بالکل بھروسہ نہیں۔ لہٰذا میں اپنی چھوٹی بیٹی کو تمہارے حوالے کر رہا ہوں تاکہ اس کی اچھی طرح پرورش و پرواخت ہو سکے اور اسے اپنے والد کی کمی محسوس نہ ہو سکے۔''

''آپ اس بچی کی مطلق فکر نہ کریں اسے کسی چیز کی کمی محسوس نہیں ہونے دوں گا۔''

شفاعت صاحب کے خاموش ہوتے ہی وہ صاحب بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئے۔ حسب وعدہ شفاعت صاحب اس بچی کو اپنے گھر لے آئے۔ اسے تعلیم یافتہ بنایا اور اس کی شادی کر دی۔

شفاعت صاحب کے یہاں کھانے لذیز بنتے ہیں۔ وہ جہاں کھانے کے شوقین ہیں وہیں انہیں دوسروں کو کھلانے کا بھی شوق ہے۔ ایک دن کا واقعہ ہے کہ کچھ لوگ ان کے یہاں کھانے پر مدعو تھے۔ کھانا اگر لذیز پکا ہو تو کھانے والا بسیار خوری پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ڈائنگ ٹیبل پر بریانی کی قابوں کو دم مارنے کی مہلت نہیں۔ ایک قاب آ رہی ہے تو

دوسری جارہی ہے۔قورمہ اور شیر مالیں پناہ مانگ جائیں گی۔ بھنے ہوئے مرغ کی ہڈیوں سے میز پٹ جائے گی۔آم کی گھٹلیوں کا ڈھیر لگ جائے گا اور ہلاکو کی کھوپڑیوں کے مینار کا واقعہ یاد آجائے گا۔مگر شفاعت صاحب ہیں کہ دوستوں کی بسیار خوری دیکھ کر کھلے جارہے ہیں، میں نے بارہا دیکھا کہ جب بھی کوئی شخص مٹھائی کا ڈبہ لے کر آیا تو شفاعت صاحب نے پہلے باہر بیٹھنے والوں میں تقسیم کیا اس کے بعد ڈبہ گھر کے اندر گیا۔

شفاعت صاحب کے مکان کے دروازے دو طرف سے کھلتے ہیں جس سے یہ اشتباہ ہوتا ہے کہ دو علیٰحدہ مکان ہے۔ یہی سبب ہے کہ فقرا دونوں طرف سے صدائیں لگاتے ہیں اور صاحب خانہ بھی انہیں مایوس نہیں کرتے۔ایک دن کا واقعہ ہے کہ میں ان کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا باتیں کر رہا تھا کہ دروازے پر کسی نے آواز لگائی اور شفاعت صاحب نے کہا فرمایئے۔ یہ سنتے ہی وہ صاحب ہکلاتے ہوئے بولے،"پرسوں میری بیٹی کی شادی ہے اور اب تک سائیکل کا انتظام نہیں ہو پایا ہے۔ لہٰذا ایک سائیکل کا انتظام کر دیتے تو بڑی مہربانی ہوتی۔ اتنا سننا تھا کہ شفاعت صاحب اندر کے کمرے میں گئے اور جب ڈرائنگ روم میں آئے تو ان کی انگلیوں میں کئی نوٹ دبے ہوئے تھے۔ جسے انہوں نے ان صاحب کی طرف بڑھا دیا۔

شفاعت صاحب ذہین طبع انسان ہیں۔ان کی آنکھوں میں ذہانت کی چمک اور لہجے میں شرافت کی گمک پائی جاتی ہے۔قدرت نے انہیں سخن فہمی اور بذلہ سنجی کا جوہر بھی عطا کیا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ برمحل بات کہنے کی صلاحیت بھی دی ہے۔ان سے جو ملا وہ ان کا گرویدہ ہوگیا۔

حدیث نبوی ہے کہ"تمہارے لئے یہ تو محال ہے کہ محض مال کے ذریعے سے تم لوگوں پر حاوی ہوسکو۔پس تم اخلاق کے بل پر حاوی ہونے کی کوشش کرو۔"

شفاعت صاحب مذکورہ حدیث کو حرز جان بنائے رکھا ہے۔جس کی وجہ سے ان کے اردگرد لوگ ویسے ہی طواف کرتے ہیں جیسے شمع فروزاں کے گرد پروانے۔

□□

جمیلہ خاتون

سیّد شاہ نعمت اللہ فریدی قدس اللہ سرہ (سجادہ نشیں خانقاہ فریدیہ پھلواری شریف، پٹنہ) کی چھوٹی صاحب زادی اور حاجی محمد ظہور عالم رضوی کی شریک حیات جمیلہ خاتون کی پیدائش ۱۲؍جون ۱۹۳۱ء کو پھلواری شریف میں ہوئی اور چھ مہینے کی عمر میں آپ کی والدہ صفیہ خاتون راہی ملک عدم ہوئیں۔ پرورش و پرواخت حاجیہ صالحہ خاتون نے کی جو رشتہ میں جمیلہ خاتون کی خلیری پھوپھی تھیں۔ جمیلہ خاتون اُنہیں پھوپھی امی کہتی تھیں اور راقم الحروف اُنہیں نانی کہتا تھا۔ آپ نہایت ہی نیک سیرت، کم سخن، صوم وصلواۃ کی پابند، خلیق، مُخیر اور حسن اخلاق کی پیکر تھیں۔ جناب فیاض احمد نے بتایا کہ جب انہوں نے بی این کالج میں داخلہ لیا تب ان کا قیام پٹنہ میں واقع مصلح پور میں تھا۔ چھٹیوں میں اکثر پھلواری شریف جاتا۔ بھابھی کی پھوپھی امی کی خاطر داری اب بھی میرے ذہن میں نقش ہے۔ چلتے وقت بڑی شفقت سے میری مٹھی میں روپیہ تھما دیتی تھیں۔ لاج میں قیام کے دوران آپ ہر ہفتے حلوہ، ٹکیہ بھجواتیں۔ خاص خاص موقعے پر پلاؤ گوشت اور میٹھا بھجوانا نہیں بھولتی تھیں۔ مجھے اُن کے حسن اخلاق سے گھر سے دور رہنے کا کبھی احساس ہوا ہی نہیں۔

جمیلہ خاتون کو اپنی بڑی بہن عالیہ خاتون سے ایک خاص انسیت تھی۔ انہوں نے اپنی بڑی بہن کو ہمیشہ بوبو کہہ کر مخاطب کیا۔ آپ جب بھی شاہین منزل آتیں جمیلہ خاتون کے چہرے پر ایک خاص قسم کی بشاشت آجاتی تھی۔ عالیہ خاتون نے بتایا کہ وہ

اور جمیلہ بچپن میں ایک ہی برتن میں کھانا کھایا کرتی تھیں اور ایک ہی بستر پر سوتی تھیں۔ آپ نے کہا کہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ سال ۱۹۳۴ء رمضان کی ۲۷ تاریخ دن کا دو بج کر دس منٹ ہوا تھا کہ زمین ہلنے لگی۔ چھت پر بوا کپڑا اپسارنے گئی تھیں۔ انہوں نے وہیں سے آواز لگائی کہ بچو بھاگو زلزلہ آ گیا۔ میں بڑے آنگن میں امرود کے درخت کے نیچے تھی۔ جمیلہ اس وقت بہت چھوٹی تھیں اور میری بغل میں کھڑی تھیں۔ میں اُن کو گود میں لے کر بھاگی تھی۔ اس واقعہ کو سنانے کے دوران ان کی آنکھیں نہ صرف نم ہوئیں بلکہ آنسو کی دھار بہہ نکلی اور آواز میں رقت طاری ہوگئی۔ اس منظر کو دیکھ کر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ بچپن کی محبت اب تک تازہ ہے۔

جمیلہ خاتون کے بچپن کا ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے مسلم مہتو (مدن پورہ بنارس) نے بتایا کہ وہ بنارسی ساڑیاں بیچنے کی غرض سے مختلف شہروں کا دورہ کرتے تھے۔ ایک بار وہ ۱۹۵۵ء کلکتہ کے لئے گھر سے نکلے تو پہلے خانقاہ فریدیہ آئے۔ بدرو (خادم شاہ صاحب) نے کہا کہ حضور کی دونوں بیٹیاں (عالیہ اور جمیلہ خاتون) نے بنارسی ساڑی دیکھنے کی خواہش ظاہر کی ہے۔ لہٰذا مسلم مہتو بنارسی ساڑیوں کی پیٹی لے کر حویلی آئے۔ ساڑیاں دکھانے کے دوران انہوں نے بچیوں سے کہا کہ وہ کلکتہ ساڑیوں کو بیچنے کے سلسلے سے جا رہے ہیں، دعا کرو کہ سب ساڑیاں بک جائیں۔ بقول مسلم مہتو "دونوں بچیوں نے بہ یک زبان ہو کر کہا کہ سب ساڑیاں نکل جائیں گی۔" مسلم مہتو جب بنارس لوٹے تو ان کے والد نے فرمایا کہ "دس دنوں کے لئے کلکتہ گئے تھے لیکن اتنی جلدی کیوں چلے آئے۔" اس کے جواب میں مسلم مہتو نے کہا کہ "ساری ساڑیاں بک گئیں، روپیہ نقد مل گیا تو کلکتہ میں ٹھہرنے سے حاصل ہی کیا ہوتا"

جمیلہ خاتون نے اپنی پھوپھی امی سے عربی اور اردو کی تعلیم حاصل کی۔ آپ کی محبت کا ثمرہ تھا کہ بچپن سے ہی پانچوں وقت کی نمازیں پابندی سے پڑھتی تھیں۔ راقم الحروف نے کبھی ان کی نماز قضا ہوتے نہیں دیکھا۔ صبح چار بجے بستر چھوڑتیں اور ضروریات سے فارغ ہو کر مصلہ پر بیٹھتیں تو صبح کے چھ بج جاتے۔ کیا مجال کہ رمضان کا روزہ چھوٹ جائے خواہ طبیعت ناساز ہی کیوں نہ ہو۔ رجب، شب برات اور محرم کے

مہینوں میں بھی باقاعدگی سے روزے رکھتی تھیں۔ طبیعت کی ناسازگی کے باعث کئی بار راقم الحروف نے ان سے روزہ نہیں رکھنے کی استدعا کی مگر ان کے ارادے میں تبدیلی نہیں آئی۔ شب برات کے موقعے پر غرباء کے درمیان تقسیم کی غرض سے خاص طور سے حلوہ اور دستی روٹی کا الگ سے نظم کیا کرتی تھیں۔ محرم کے موقعے پر کربلا میں شربت ضرور بھجواتیں۔ آپ کے اِس خلوص پر میں نے کئی بار گذارش کی تھی کہ اب کربلا میں لفنگے ہوتے ہیں، کہاں پریشان ہوتی ہیں۔ میرے خاموش ہوتے ہی انہوں نے فرمایا کہ کچھ اچھے لوگ بھی ضرور ہوں گے تم سامان بھجوانے کا نظم کرو۔ میری عدم دلچسپی کو بھانپتے ہوئے اُنہوں نے ایک بوا کا نظم کرلیا تھا۔ جس کا نام زلیخا تھا۔ میر شکار ٹولی کی رہنے والی تھیں۔ عام دنوں میں اس بوا کا درشن ہو یا نہ ہو مگر محرم، شب برات اور بقر عید کے موقعے پر باقاعدگی سے آتی تھی۔ خود بھی فائدہ اٹھاتی اور دوسروں کو بھی فیض پہنچاتی۔ باجی فلاں غریب ہے۔ باجی فلاں کی زندگی بڑی کس مپرسی میں گذر رہی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جہاں محرم کے موقعے پر کھچڑہ پانچ کیلو باسمتی کا بنتا تھا وہیں اس کے قدموں کی برکت سے دس کیلو چاول کا بننے لگا۔

جمیلہ خاتون بقر عید کے موقعے پر قربانی کا گوشت اپنی نگرانی میں تقسیم کرواتی تھیں۔ جن غرباء کو جانتی تھیں ان سبھوں کا حصّہ ضرور نکالتیں۔ خواہ وہ مسلسل آنے والی ہو یا کبھی کبھار۔ ان کی اس کیفیت کا اندازہ کچھ مانگنے والوں کو ہوگیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ بعض مانگنے والیوں کو میں نے یہ کہتے سنا کہ "باجی میرا حصّہ گوشت رکھ دیجئے گا۔ بقر عید کے دوسرے دن لے جاؤں گی۔" بلا مبالغہ ایسے لوگوں کا حصّہ رکھ دیا جاتا تھا۔ رمضان کے دنوں میں مسجد میں افطار بھجوانا بھولتی نہیں تھیں۔ جب تک بدن میں طاقت رہی خود سے افطار بنایا، طاقت گھٹی تو بوا سے بنوا کر بھجوایا۔

جمیلہ خاتون کے متعلق چند واقعات درج کیے جاتے ہیں جو ان کی شخصیت کے مختلف گوشوں کو اجاگر کرتے ہیں۔

فیاض احمد نے بتایا کہ وہ ملازمت کے سلسلے سے ۱۹۶۵ء سے پٹنہ میں ہیں۔ جب بڑے بھائی (محمد ظہور عالم رضوی) کا تبادلہ پٹنہ ہوا تو وہ بھابھی سے ملنے گئے۔ بھابھی نے تاکید کی تھی کہ کھانا یہیں آکر کھالیجئے۔ اور یہ سلسلہ تین برسوں تک چلا۔

فیاض احمد نے بتایا کہ بڑے بھائی صاحب پٹنہ میں ملازمت کے دوران گھر بنوا رہے تھے۔ ابھی تعمیر کا کام مکمل نہیں ہوا تھا کہ ہزاری باغ تبادلہ کا آڈر آ گیا، لہٰذا تعمیر کا کام مکمل کرنے کی ذمہ داری میرے سر پر آ گئی۔ مکان جب ہر طرح سے مکمل ہو گیا تو انہوں نے اس کی خبر اپنے بھائی کو دی اور یہ بھی کہا کہ لوگ کرائے پر مکان لینے کے لئے دوڑ رہے ہیں۔ بھائی صاحب کا جواب آیا کہ تمہاری بھابھی کا کہنا ہے کہ مکان کرایہ پر نہیں لگے گا۔ فیاض بابو کرایہ کا مکان چھوڑ کر اسی مکان میں رہیں۔ لہٰذا انہوں نے ایسا ہی کیا اور کئی برسوں تک رہے۔

بقول فیاض احمد ان کی والدہ اکتوبر ۱۹۸۷ء میں سخت علیل ہوئیں اور ذی فراش ہو گئیں۔ چنانچہ بڑی بھابھی نے کئی ماہ تک دیہات میں رہ کر اپنی ساس کی خدمت کی اس دوران انٹر کے امتحان کا پروگرام نکل گیا اور بھابھی بیٹی کو امتحان دلوانے پٹنہ آ گئیں۔ ان کے پٹنہ آنے کے لگ بھگ ایک ہفتہ کے بعد یعنی ۲ رجنوری ۱۹۸۸ء کو والدہ کے انتقال کی خبر آئی۔ یہ خبر سنتے ہی بھابھی صاحبہ نے بھیا سے کہا کہ وہ بھی اپنی ساس کا آخری دیدار کرنے جائیں گی۔ یہ سنتے ہی بھائی صاحب نے ان کی بات یہ کہہ کر کاٹ دی کہ تین ماہ رہ کر ابھی تو آئی ہو۔ چنانچہ میں اور بھائی صاحب گھر کے لئے روانہ ہو گئے۔ چالیسواں کے موقعے پر جب بھائی صاحب نے بھابھی سے چلنے کو کہا تو وہ گویا ہوئیں "مرحومہ کا آخری دیدار تو ہوا نہیں صرف بھات کھانے جائیں۔"

جناب نیر اعظم نے فرمایا کہ دوران تعلیم جب ان کا قیام پٹنہ میں تھا تو وہ ایک دن پھلواری شریف پہنچے۔ دروازے پر دستک دے کر وہ اندر آ گئے۔ جب بھابھی جمیلہ خاتون کو خبر ملی تو انہوں نے باہر کے کمرے میں بستر لگوا دیا۔ آرام کی غرض سے وہ اس پر دراز ہو گئے۔ اس درمیان بدرو آئے اور بھابھی سے کہا کہ جو مہمان آئے ہیں ان کو حضور بلا رہے ہیں۔ بھابھی نے کہا ایسا کوئی مہمان نہیں آیا ہے جسے حضور سے کام ہو۔ میرا دیور آیا ہے جسے حضور جانتے بھی نہیں ہوں گے۔ بدرو چلے گئے اور جب دوبارہ واپس آئے تو کہا کہ آپ کے دیور کو ہی حضور بلا رہے ہیں۔ لہٰذا نیر اعظم بدرو کے ہمراہ خانقاہ چلے گئے۔ شاہ صاحب سے علیک سلیک ہوئی اور انہوں نے ان کا بستر اپنے حجرے سے سٹے کمرے

میں لگوادیا۔ نیّر صاحب آرام کی غرض سے اس پر لیٹ گئے۔ ظہر کی نماز پڑھ کر جب وہ کمرے میں آئے تو دیکھا کہ مرغ کا گوشت، بھنا ہوا گوشت، کوفتہ اور پلاؤ دسترخوان پر موجود ہے۔ بدرو نے ان سے کہا کہ آپ تناول فرمالیں۔ نیّر اعظم نے کہا کہ شاہ صاحب کے دسترخوان پر بیٹھنے کے بعد ہی کھانا کھایا جائے گا۔ بدرو اور نیّر اعظم اپنی اپنی ضد پر قائم تھے کہ اس درمیان حجرے سے آواز آئی، ''بیٹھو اور کھانا کھالو۔'' بدرو جب شاہ صاحب کا کھانا لے کر خانقاہ پہنچے تو نیّر اعظم بضد ہو گئے کہ حضور کا کھانا دِکھلاؤ۔ بادل ناخواستہ بدرو نے کھانا دکھلایا۔ بقول نیّر اعظم چپاتی اور دال دیکھ کر وہ دنگ رہ گئے۔ انہوں نے آگے بتایا کہ رات میں اچانک ان کی آنکھ کھل گئی دیکھا کہ شاہ صاحب پنکھا جھل رہے ہیں۔ وہ فوراً اُٹھ بیٹھے۔ شاہ صاحب پنکھا رکھ کر اپنے حجرے میں چلے گئے۔ جب نیّر اعظم کی دوبارہ آنکھ کھلی تو دیکھا کہ شاہ صاحب دوبارہ پنکھا جھل رہے ہیں۔ ان کے اٹھتے ہی شاہ صاحب نے پنکھا رکھا اور کنواں کے پاس چلے گئے۔ منہ دھویا، وضو بنایا اور ایک بالٹی پانی دالان میں رکھ دیا۔ ''وضو کرو اور تہجد کی نماز پڑھو۔'' یہ کہتے ہوئے شاہ صاحب اپنے حجرے میں چلے گئے۔ بقول نیّر اعظم وہ اس کشمکش میں مبتلا تھے کہ آیا شاہ صاحب کا لایا ہوا پانی سے وضو کریں یا خود کنواں پر جا کر وضو کریں۔ اسی درمیان حجرے سے آواز آئی کہ بالٹی کے پانی سے وضو کرو۔ نیّر اعظم شاہ صاحب کے اخلاق حسنہ سے کافی متاثر ہوئے اور دل ہی دل میں خیال کیا کہ سوموار کو بھی رہا جائے تاکہ شاہ صاحب کی قربت حاصل ہو سکے۔ مگر سوموار کی صبح شاہ صاحب نے فرمایا کہ اب تم جاؤ کلاس ناغہ مت کرو۔ ہاں اپنی بھابھی سے ضرور ملتے جانا۔ نیّر اعظم جب حویلی آئے تو اپنی بھابھی سے کہا کہ ایک بات کہوں اگرچہ انہیں بتانے میں تامل ہو رہا تھا مگر بھابھی کے اصرار پر وہ گویا ہوئے کہ ''میرے آنے کا مقصد یہ تھا کہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ سکوں کہ شاہ صاحب کی غذا کتنی مرغن ہوتی ہے۔'' یہ سنتے ہی ان کی بھابھی نے فرمایا کہ اسی لئے تمہیں ابی نے خانقاہ میں بلایا تھا تاکہ تمہاری بدگمانی دور ہو سکے اور تم گناہ سے بچ سکو۔ آخری جملے سے جمیلہ خاتون کی شخصیت اور شاہ صاحب کی روحانیت کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔

جمیلہ خاتون اپنے سرہانے پرس میں دس پچاس اور سو کے نوٹ رکھا کرتی

تھیں۔ مانگنے والی آئی اور انہوں نے سرہانے پرس ٹٹولا۔ کبھی خود سے نکال کر دیا اور کبھی بغل میں بیٹھے ہوئے شخص کو ہدایت کی۔ الغرض ضرورت مندوں کی مدد کرنے میں ان کی طبیعت کو ایک خاص قسم کی لذت ملتی تھی۔ ان کے بستر علالت کے دوران ایک صاحبہ آئیں جن کی بیٹی سخت علیل تھی۔ انہوں نے علاج کروایا تھا مگر مزید علاج کی ضرورت تھی۔ والدہ نے مجھ سے کہا ''بابو دس ہزار اکاؤنٹس سے نکال کر لے آؤ فلاں کو دینا ہے۔'' میں نے ان کے حکم کی تعمیل میں دیر نہیں کی۔ ایک صاحب بنارس سے آئے۔ بیٹی کی شادی میں تعاون کے طلب گار تھے۔ والدہ نے انہیں بھی دس ہزار دینے کی ہدایت کی۔

جمیلہ خاتون کی خدمت کے لئے شاہین مامور تھیں۔ عالم گنج کی رہنے والی تھیں۔ اس نے کم و بیش ایک سال تک والدہ کی خدمت کی۔ والدہ نے اس کے لئے یہ کہتے ہوئے کان کا سونے کا جھمکا بنوا دیا تھا کہ شادی کے موقعے سے پہنوگی۔ اس جھمکے پر آٹھ ہزار کا صرفہ آیا تھا۔

جمیلہ خاتون گھر میں آنے والے سوالی کو کچھ دے دینے کی ہمیشہ تلقین کیا کرتی تھیں۔ بارہا ایسا ہوا کہ ہٹے کٹے فقیر کو دیکھ کر راقم الحروف بگڑ جاتا مگر والدہ ہمیشہ یہی کہتیں کہ ''کچھ دے دو، بھگاؤ مت۔''

جمیلہ خاتون کے منجھلے بیٹے (مظہر عالم) کا انتقال ۱۹ر جولائی ۲۰۰۸ء کو ہوا۔ چالیس دن تک غریب کو کھانا کھلانے کی بات طے ہوئی۔ سلمیٰ کی ماں ایک غریب عورت کو لے آئی اس سے کہا گیا کہ شب کے سات بجے برتن رکھ دیا کرو اور آٹھ بجے آکر کھانا لے جایا کرو۔ کچھ دنوں تک کھانا لے جانے والی نے اس پر عمل کیا بعد میں شام ہی میں برتن رکھنے لگی اور دو یا تین بار آکر دیکھتی کہ برتن میں کھانا رکھا گیا ہے یا نہیں۔ وہ جب بھی آتی بغیر کھٹکھٹائے چلی آتی۔ اس کی اس حرکت پر میرا پارہ کئی بار چڑھا مگر والدہ کی پیشانی پر کبھی بل نہیں پڑا۔ انہوں نے ہمیشہ یہی کہا کہ غریب ہے۔ چالیس دن مکمل ہو جانے کے بعد بھی یہ سلسلہ چلتا رہا کہ وہ غریب ہے۔ حتیٰ کہ جب والد صاحب کا انتقال (یکم اکتوبر ۲۰۰۸ء) ہوا تو یہ سلسلہ مزید دراز ہو گیا۔

جمیلہ خاتون ۲۷ر اکتوبر ۲۰۱۱ء کو جیوک ہارٹ ہاسپٹل سے گھر آنے کے

دوسرے ہی دن فرمایا کہ ایک خصّی صدقہ کر دو۔ میں ۲۹ ر اکتوبر کو شمیم کے گھر پر گیا جو بدر گھاٹ میں واقع ہے۔ شمیم کے بھائی کو لے کر بازار سمیتی واقع بکری بازار سے ایک خصّی تین ہزار دو سو میں خریدا گیا۔ شمیم کا بھائی اس خصّی کو رکشا پر لاد کر محلّہ شاہ ارزاں میں واقع حسین احمد کے مدرسہ میں لے آیا۔ وہیں جانور ذبح ہوا۔ اس کام سے فارغ ہو کر میں تقریباً دس بجے گھر پہنچا۔ زلیخا بوا والدہ کے قریب بیٹھی ہوئی تھیں۔ میں نے والدہ سے جب کہا کہ خصّی صدقہ کر دیا گیا ہے۔'' تو میرے خاموش ہوتے ہی والدہ نے انگلی سے زلیخا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ ''اسے بھی گوشت دے دو۔''

سید شاہ نعمت اللہ قدس اللہ سرہ کی دونوں بیٹیاں عالیہ خاتون اور جمیلہ خاتون اپنے والد سے بیعت تھیں۔ جن کی دعاؤں سے والدہ ایک خاص قسم کی دیکھنے کی صلاحیت رکھتی تھیں جو عام نظریں دیکھنے سے قاصر تھیں۔ وہ والدہ کی نظریں دیکھ لیتی تھیں۔ بقول رئیس اعظمؔ والدہ نے کہا کہ '' بیٹا احاطہ میں پکا ہوا پپیتا گرا ہوا ہے اٹھا کر لے آؤ۔'' جب وہ باہر گئے تو دیکھا کہ پپیتا کے درخت کے نیچے واقعی ایک پکا پپیتا گرا ہوا تھا۔ راقم الحروف سے والدہ نے فرمایا تھا کہ مغرب کے وقت چھت پر مت جایا کرو نہایت گورے رنگ کی عورت جس کی آنکھیں نہایت کالی ہیں اکثر چھت پر آتی ہے۔ گویا ان کا یہ اشارہ مجھے خطرات سے بچانے کی تلقین تھی۔

جمیلہ خاتون کو حج بیت اللہ کی بھی سعادت نصیب ہوئی تھی۔ وہ ۱۹۹۰ء میں اپنے شوہر کے ہمراہ حج کے لئے روانہ ہوئی تھیں اور اس سفر میں دونوں کے ساتھ سیّد شاہ محمد ابوالمکارم قدس اللہ سرہ بھی تھے۔

جمیلہ خاتون کی شخصیت کا ایک درخشندہ پہلو یہ بھی ہے کہ انہوں نے نہ کبھی کسی کی شکایت کی اور نہ ہی کسی کا شکوہ سننے میں دلچسپی دکھائی۔ نیّر اعظم نے بتایا کہ وہ کئی بار بھابھی سے ملے مگر کبھی بھی ان کی زبان سے کسی کی شکایت نہیں سنی۔ جب انہوں نے اس کا ذکر دوسرے لوگوں سے کیا تو سبھوں نے یک زبان یہی کہا کہ ''ان کی شخصیت سبھوں سے جدا تھی دوسروں کی شکایت کرنا تو کجا کسی کی شکایت سننا بھی انہیں گوارہ نہ تھا۔''

جمیلہ خاتون نہایت کم سخن تھیں۔ یہاں پر دو واقعے درج کیے جاتے ہیں۔ فیاض احمد

نے فرمایا کہ کلکتہ کے سفر کے دوران ان کا قیام دونوں کے لئے پھلواری شریف میں ہوا۔ قیام کے دوران بھابھی کی خاطرداری اور خوش اخلاقی کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ انہوں نے سفر کے لئے پراٹھا اور گوشت الگ الگ ٹفن کے ڈبّے میں رکھ دیا تھا۔ بھائی صاحب نے دونوں چیز کو ایک ساتھ کر دیا۔ جس کے نتیجے میں شوربا گر پڑا اور ٹفن گندا ہوگیا۔ شوربا گرتے ہی بھائی صاحب بھابھی پر برسنے لگے کہ تمہیں بتانا چاہئے تھا کہ گوشت شوربے دار ہے۔ حالانکہ بھابھی کی غلطی نہیں تھی پھر بھی وہ خاموش رہیں اور سامان کو دوسرے ٹفن کے ڈبّے میں رکھ دیا۔

بقول نیّر اعظم انہوں نے اپنی والدہ اظہار حیدری سے جب استفسار کیا کہ سبحان احمد کی پانچ بہوئیں ہیں ان سبھوں میں آپسی چپقلش ہوتی رہتی ہوگی اس موقعے پر بڑی بہو جمیلہ خاتون کا کیا رول ہوتا ہے۔ اس ضمن میں اظہار حیدری نے فرمایا کہ بڑی بہو جب سسرال آتیں تب لوگ ان کے آنے اور جانے کے وقت سلام کی آواز سنتے تھے۔ یہ واقعہ ہے کہ ان کی آواز کبھی گھر سے باہر سنائی نہیں دی۔

جمیلہ خاتون اپنا کام خود کیا کرتی تھیں۔ وہ نوکر یا نوکرانی سے کام کروانے میں یقین نہیں رکھتی تھیں۔ میں نے کبھی ان نوکر اور نوکرانی کو سخت سست کہتے نہیں سنا۔ والد صاحب کی پوسٹنگ نیپال میں واقع براٹ نگر میں تھی۔ کوسی پروجیکٹ کی کالونی میں رہائش پزیر تھے۔ شام کا وقت تھا۔ آفس کے چند لوگ جیپ سے کہیں جا رہے تھے۔ راستے میں جال پھینک کر مچھلی پھنسائی جا رہی تھی۔ تازہ اور زندہ مچھلی دیکھ کر والد صاحب نے خرید لیا اور گھر لے آئے۔ بوا کے رہتے ہوئے والدہ ہسوا اور مچھلی لے کر بنانے لگیں۔ جب بوا نے دیکھا تو والدہ سے لے کر خود بنانے لگیں۔ مذکورہ بوا محلہ نہسہ پھلواری شریف کی رہنے والی تھیں۔ کئی برسوں تک انہوں نے ہم لوگوں کی خدمت کی۔

جمیلہ خاتون کو اپنی بیٹیوں سے کچھ زیادہ ہی لگاؤ تھا۔ بستر علالت کے دوران جب بھی بیٹیاں آتیں تو آپ کے چہرے پر ایک خاص قسم کا سکون نظر آتا۔ بیٹی کے جانے کے وقت والدہ یہ ضرور کہتیں کہ ”بیٹی آتی رہو تم لوگوں کو دیکھ کر میں اپنی تکلیف بھول جاتی ہوں۔“

جمیلہ خاتون اپنی علالت کے دوران دو ڈاکٹر صاحبان سے دکھانے کی اکثر

ہدایت کیا کرتی تھیں۔ پہلا نام ڈاکٹر حسین احمد (رمنا روڈ) کا ہے۔ حسین صاحب سے رجوع کرنے میں مجھے قباحت یہ ہوتی تھی کہ وہ فیس نہیں لیتے تھے۔ ایسی صورت میں بار بار جانا طبیعت پر گراں گزرتا تھا۔ مگر والدہ کے اصرار پر کئی بار گیا۔ ڈاکٹر صاحب گھر پر آ کر بھی دیکھ لیا کرتے تھے۔ اس کے باوجود فیس لینے سے انکار کر دیا کرتے تھے۔ دوسرا نام ڈاکٹر معین خاں کا جو عالم گنج کے گلشن بہار اپارٹمنٹ میں رہتے ہیں۔

والدہ کو پیشاب کی تکلیف کے دوران دیکھنے کے لئے ڈاکٹر آصف راز گھر پر آئے اور میں بھی کئی بار ان کے شاہی اسٹون کلینک پر گیا مگر انہوں نے فیس لینے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ آپ کے والد بزرگوار سے میرے والد بزرگوار کے بڑے اچھے تعلقات تھے۔ میں جب بھی ان کی کلینک پر گیا بہت شفقت سے ملے۔ مریضوں کی ریل پیل میں بھی انہوں نے پہلے مجھے ہی بلوایا۔

والد صاحب کثرت سے لوگوں کو کھانے پر مدعو کیا کرتے تھے۔ آئے دن کسی نہ کسی کی دعوت ہوا کرتی تھی۔ تمام لوگوں کا کھانا خود والدہ اپنے ہاتھوں سے پکاتیں مگر ان کی پیشانی پر کبھی بل نہیں پڑا۔ والد صاحب کا ٹرانسفر جب پٹنہ ہوا اور سرکاری رہائش گاہ 'آر' بلاک کے چھ نمبر روڈ میں الاٹ ہوا تو رشتہ داروں کی آمد کا سلسلہ سیلاب کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ روزانہ تقریباً بیس آدمی کا کھانا پکتا تھا۔ مہمان کی آمد یا دعوت کے موقعے پر مذکورہ تعداد میں اضافہ ہو جاتا۔ اس کے باوجود والدہ نے نہ کبھی زبان سے ناگواری کا اظہار کیا اور نہ ہی اپنے طرز عمل سے۔ خواجہ کی دیگ کی طرح والدہ کی ہانڈی تھی۔ ہر شخص مستفیض ہو رہا ہے۔ بارہا ایسا ہوا کہ لوگ دو پہر کے تین بجے آ دھمکے۔ ایسی صورت میں والدہ ان کے کھانے کا بھی نظم کیا کرتی تھیں۔ فیاض احمد نے بتایا کہ وہ جب بھی شاہین منزل گئے بھابھی علالت کے دوران بھی حسن اخلاق سے پیش آتیں۔ میرے بیٹھتے ہی بوا کو ناشتہ چائے لانے کا حکم دیتیں۔ پرس سے پیسے نکال کر پان منگواتیں۔ دن کا کھانا کھا کر ہی جانے کا اصرار کرتیں اور چلتے وقت چائے کا بھی اہتمام کراتیں۔

جمیلہ خاتون بستر علالت کے دوران بھی لوگوں کی دعوت کرنا بھولتی نہیں تھیں۔ عامر صمدانی اور ان کی بہن سیما والدہ کے وصال سے پانچ چھ دن قبل عیادت کی غرض

سے گھر پر آئے تھے۔ راقم الحروف سے والدہ نے کہا ''دونوں کو کھانے پر بلاؤ۔'' قدیرہ خاتون (راقم الحروف کی خالہ زاد بہن) کی بیٹی کی شادی کے موقعے پر والدہ نے کہا تھا کہ ''نوعروس جوڑے کو کھانے کی دعوت پر ضرور بلانا۔'' والدہ کا یہ جملہ وصال سے دو دن قبل کا ہے۔

والد صاحب کے انتقال کے بعد والدہ نے کہا تھا کہ تین سال کے بعد میرا بھی انتقال ہو جائے گا۔ اس وقت ان کی یہ بات عجیب و غریب لگی تھی مگر بعد میں صحیح ثابت ہوئی۔

فیاض احمد نے بتایا کہ بھابھی کی علالت کے آخری ایام میں وہ جب بھی شاہین منزل گئے بھابھی نے کئی بار کہا کہ فیاض بابو میری غلطی معاف کر دیجئے گا۔ یہ سنتے ہی انہوں نے کہا کہ آپ پہلے غلطی بتایئے۔ جب غلطی ہوئی نہیں تو معافی کس بات کی۔

وصال سے دو دن قبل والدہ نے مجھ سے کہا تھا کہ ''بابو میرے لئے دعا کرو کہ میرا گناہ اسی دنیا میں معاف ہو جائے۔'' میں نے کہا کہ ''آپ سے گناہ سرزد ہی کہاں ہوا ہے۔'' میرے خاموش ہوتے ہی انہوں نے فرمایا ''جو بھی گناہ ہو اسی دنیا میں معاف ہو جائے۔''

والدہ نے وصال سے ایک ہفتہ قبل کہا تھا کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ میرے بستر کے اوپر جو پنکھا لٹک رہا ہے اس کی ایک پتی گر گئی ہے۔ میں دماغ دوڑاتا رہا مگر بات سمجھ میں نہیں آئی۔ کبھی یہ خیال آیا کہ پنکھا سے پتی نکال دوں، کبھی یہ خیال آیا کہ پنکھا اتار دوں۔ مگر والدہ کے انتقال کے بعد ذہن میں دو قسم کے خیالات آئے۔ پہلا یہ کہ والدہ جس کمرے میں سوتی تھیں وہاں دو مسہری تھی ایک پر والدہ اور شاہین دوسرے پر صدف۔ غرض کہ اس کمرے میں تین لوگ ہوئے ان میں سے ایک شخص کی ملک راہی عدم کی طرف کوچ کا اشارہ تھا۔ دوسرا خیال یہ کہ نیچے کی منزل میں شاہین کو چھوڑ کر گھر کے تین افراد ہوئے ان میں سے ایک کا ملک راہی عدم کی طرف کوچ کا اشارہ تھا۔ الغرض اس خواب کی تعبیر میں ایک شخص کا ملک راہی عدم کی طرف کوچ ہی نکلتا ہے۔

آخری ایام میں والدہ دوا کھانے میں عدم دلچسپی کا مظاہرہ کرنے لگی تھیں۔ مجھے

تشویش ہوتی تو دوا کھانے کا اصرار کرتا مگر آپ خاموش ہی رہتیں۔ البتہ کبھی آپ کے چہرے سے بیزاری نمایاں ہو جاتی تھی۔ جس کی وجہ سے دوبارہ اصرار کرنے کی مجھ میں ہمت نہ ہوتی۔ سانس کی تکلیف میں اضافہ ہوتا تو ڈاکٹر بلوائے جاتے۔ نئی دوائیں تجویز ہوتیں۔ میں والدہ کو دوا کھلاتا۔ اس کے باوجود تکلیف بدستور قائم رہتی۔ والدہ دوران تکلیف فرماتیں ''بابو آرام نہیں مل رہا ہے۔'' والدہ کا یہ جملہ میرے دل پر نشتر زنی کا کام کرتا تھا۔ کاش! میرے ہاتھ میں کچھ ہوتا تو پلک جھپکتے ہی ٹھیک کر دیتا۔

والدہ یوں تو کئی امراض میں مبتلا تھیں۔ مثلاً قلب، تنفس اور گھٹیا۔ دوائیاں چلتی رہتی تھیں۔ گھٹیا کا اعلاج اتر پردیش تک ہوا مگر افاقہ نہ ہوا۔ سندھی سُدھا تیل کا جب علم ہوا تو میں نے منگوا دیا تھا۔ قدرے افاقہ تھا۔ والدہ کی بیماری کی وجہ سے باہر نکلنا بہت کم ہو گیا تھا۔ ۱۹؍اکتوبر کو دو بجے گھر سے باہر نکلا۔ جوں ہی بہار اسٹیٹ مدرسہ ایجوکیشن بورڈ کے گیٹ پر پہنچا ہی تھا کہ موبائیل کی گھنٹی بجی اور معلوم ہوا کہ والدہ کی طبیعت خراب ہو گئی ہے۔ میں فوراً گھر واپس آیا۔ ایمبولنس بلوا کر اروند ہاسپٹل میں داخل کروایا۔ شب بھر آئی سی یو میں رہیں۔ صبح ہوتے ہوتے جیوک ہاسپٹل میں بھرتی کروایا۔ جانچ اور دوا شروع ہوئی۔ ۲۷؍ اکتوبر کو ہاسپٹل سے چھٹی ملی۔ رئیس اعظم (راقم الحروف کے چھوٹے بھائی) والدہ کو گھر لے آئے اور میں وہیں سے دوا لینے نکل گیا۔ اروند ہاسپٹل سے جیوک ہاسپٹل تک بارہ دفعہ والدہ کے قلب نے بے وفائی کا مظاہرہ کیا مگر ڈاکٹر کی مستعدی سے حالات قابو میں آتے گئے۔ ۱۹؍نومبر شام پانچ بجے والدہ نے سانس کی تکلیف بتائی۔ آکسیجن کا نظم گھر پر تھا لہٰذا فوراً آکسیجن لگایا گیا۔ کچھ دیر کے بعد آپ نے ہٹانے کا اشارہ کیا۔ اس درمیان آپ نے فرمایا کہ ''بابو کل نہلا دو گے۔'' میں دل ہی دل میں پریشان ہوا کہ ٹھنڈک میں نہلایا کیسے جائے گا۔ گیارہ بجے شب میں والدہ نے کہا جی متلا رہا ہے۔ منہ کے آگے برتن رکھا گیا۔ کئی بار جی متلایا مگر متلی نہیں ہوئی۔ میں نے فوراً ڈاکٹر سے رجوع کیا۔ اس نے انجکشن لگوانے کی ہدایت کی۔ محسن صاحب کمپاؤنڈر کو فون پر خبر دی گئی۔ وہ بخار کی حالت میں آئے اور انجکشن لگایا۔ جس سے جی متلانے کی کیفیت میں افاقہ ضرور ہوا۔ مگر شب کے بارہ بجے سانس کی تکلیف دوبارہ شروع ہوئی۔ نیبولائزر لگایا گیا افاقہ نہیں ہوا۔ دوبارہ

آکسیجن لگایا گیا۔ میں نے ڈاکٹر معین خان سے رجوع کیا۔ انہوں نے کہا کہ ہوسکتا ہے سینہ میں پانی آگیا ہو جس سے سانس لینے میں تکلیف ہو رہی ہو۔ لیسیس کا انجکشن لگوا دیجئے۔ محسن صاحب کو دوبارہ فون کیا گیا۔ وہ آئے اور انجکشن لگایا۔ اس درمیان رئیس اعظم خالی سلینڈر بھروا کر لے آئے۔ والدہ کا ہاتھ پیر ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ میں تلوے میں کڑوا تیل کی مالش کرنے لگا۔ دونوں بیٹیاں رضیہ شاہین اور فرحانہ شاہین بھی والدہ کے قریب تھیں۔ والدہ نے فرمایا کہ قرآن شریف پڑھ کر دم کرو۔ رضیہ شاہین نے فوراً قران پاک کی تلاوت شروع کردی اور فرحانہ شاہین ہتھیلی میں کڑوا تیل کی مالش کرنے لگیں۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ آپ مجھ سے کچھ کہہ رہی ہیں لہٰذا میں نے ماکس ہٹا دیا۔ والدہ کی آواز آئی ''بابو میری سانس اُکھڑ رہی ہے۔'' میں نے کہا گھر پر آکسیجن کا نظم ہے۔ ڈاکٹر معین خان سے فون پر بات ہوئی ہے۔ دوا چل رہی ہے۔ انشا اللہ سب ٹھیک ہوجائے گا۔ والدہ نے کروٹ بدلی۔ آپ کا چہرہ پچھم جانب ہوگیا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ آپ نے خود سے کیسے کروٹ لی جبکہ ایک ماہ سے بغیر کسی کے مدد کے آپ کا کروٹ لینا ممکن نہ تھا۔ مگر یہ کروٹ آخری کروٹ ثابت ہوئی۔ انا للّٰہ و انا علیہ راجعون۔ جنازے کو دونوں بیٹیوں نے غسل دیا۔ ۲۰ رنومبر کو آپ کا جسد خاکی خانقاہ فریدیہ لے جایا گیا۔ وہیں نماز جنازہ ادا کی گئی اور لعل میاں کی درگاہ سے سٹے قبرستان میں مدفون ہوئیں۔

آسمان تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

□□

ڈاکٹر محمد مظاہر الحق کی تصنیفات وتالیفات

مطبوعہ

☆ خونی عاشق	۱۹۸۷ء
☆ شان بہار	۱۹۹۰ء
☆ حکیم لطیف احمد اور اُن کی تاریخ گوئی	۱۹۹۴ء
☆ سیدہ اور ان کی تاریخ گوئی	۱۹۹۷ء
☆ اُردو شاعری کا احتجاجی شعور	۲۰۰۴ء
☆ مطالعات	۲۰۰۸ء
☆ مستند ہے میرا فرمایا ہوا	۲۰۰۹ء
☆ مقالات نو	۲۰۱۲ء

غیر مطبوعہ

☆ وہ اکثر یاد آتے ہیں

☆ سوانح حیات مولانا الحاج سید شاہ محمد نعمت اللہ فریدیؒ

☆ سوانح حیات محمد ظہور عالم رضویؒ

☆ ہمارے تبصرے

☆ خطوط بنام ڈاکٹر محمد مظاہر الحق

MAQALAT-E-NAV
By :
Dr. Md. Mozaherul Haque